لکھنؤ

تعمیرِ حیات

پندرہ روزہ

ہماری دعوت

ہم علی الاعلان ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں کہ ہم اس ملک میں حصہ رسد بٹانے نہیں آئے تھے۔ ہم ان ملکوں کو چھوڑ کر جو خود دولت سے بھرے ہوئے تھے یہاں کی دولت میں حصہ لگانے نہیں آئے تھے۔ ہم ایک مشن، ایک خدمت پر آئے۔ ہم یہاں خدا کے بندوں کو خدا کا بندہ بنانے آئے تھے۔ یہاں جو مسلمان آئے تھے وہ اخلاق، محبت، خدا پرستی کا پیغام لے کر آئے تھے۔ انہوں نے اس ملک کو کچھ دیا، لیا نہیں۔ وہ یہاں سے کچھ لینے نہیں آئے تھے، اس کو کچھ دینے آئے تھے۔ وہ رہنے آئے تھے، یہاں سے جانے کے لئے نہیں آئے تھے، اگر ایسا سوچتے تو اٹالہ کی ایسی شاندار و پائدار مسجد نہ بناتے۔ وہ تو خدا پرستی اور انسان دوستی کی دعوت دیتے تھے۔ کہاں کے عرب، کہاں کے عجم، یہ سب ہماری بنائی ہوئی خود ساختہ حدیں ہیں۔ ساری دنیا کے پیدا کرنے والے خالق و مالک اور رزاق اور ساری دنیا کو بغیر شرکت کے چلانے والے ایک اللہ کی طرف سے وہ یہ تعلیم لائے تھے۔ انہوں نے دنیا سے لئے بغیر ساری دنیا کی خدمت کی، انہوں نے سچے موتیوں سے انسانیت کی جھولی بھر دی اور اپنے ہاتھ خالی رکھے۔ اپنے بچوں کی مطلق فکر نہ کی اور اپنے کنبے کی طرف سے آنکھیں بند کر کے پیٹ پر پتھر باندھ باندھ کر لوگوں کی سیوا کی، ان کی تکلیفوں کو راحتوں سے بدلا، جو آیا غرباء میں تقسیم کیا، ضرورتمندوں کی جھولیاں بھریں، انہیں خادم اور ملازم دئے اور اپنے بچوں کو بالکل محروم رکھا۔ ایک دفعہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چٹائی پر لیٹے تھے، جسم پر نشانات پڑ گئے تھے۔ حضرت عمرؓ نے دیکھا تو کہا اللہ اکبر آپ اللہ کے رسول ہو کر اس تکلیف میں رہیں اور دنیا کا خون چوسنے والے ظالم قالینوں اور مسہریوں پر آرام کریں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا عمرؓ، عیش تو آخرت کا عیش ہے۔

ہم مسلمانوں سے کڑوی بات کہتے ہیں۔ ہم ان سے کہتے ہیں تم نے ان باتوں کو مانا ہے، تمہارا ان پر ایمان ہے۔ تم ان اخلاق و کردار کو چھوڑ کر جانوروں کی سطح پر آ گئے، تم اپنے کردار اور عمل سے اسلام کو بدنام کرتے ہو، اس کے روشن نام کو بٹہ لگاتے ہو۔ تم دنیا کو اسلامی زندگی کی جو چلتی پھرتی فلم دکھلا رہے ہو وہ بڑی افسوسناک ہے۔ تم نے جو زندگی کا نمونہ پیش کیا ہے، اس میں کون سی جاذبیت (ATTRACTION) ہے۔ پہلے تم جس راہ سے گزر جاتے تھے نقش چھوڑ جاتے تھے، دیر تک تمہاری خوشبو محسوس ہوتی رہتی تھی، جیسے نسیم کی خوشگواری محسوس ہوتی رہتی ہے۔ مسلمان جدھر سے گزر گئے گلی کوچے معطر کر گئے اور جہاں سے چلے آئے وہاں سے سفارتیں بھیجی گئیں کہ ہمارے ملک میں سب کچھ ہے مسلمان نہیں جنہیں دیکھ کر لوگ اپنی زندگی درست کریں اور جو ان کے مقدمات و معاملات میں بے لاگ فیصلہ کریں۔ اُن کی خواہش پر مسلمان بھیجے گئے۔ افسوس اب تم ایسے بن گئے کہ تمہارے نہ ہونے سے ملک میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ آج تک کسی نے اپنے ملک سے ماہرینِ فن، ڈاکٹروں اور دستکاروں کو نکالا ہے؟ مشرقی پنجاب میں لوہاروں کی ضرورت تھی تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ بسائے گئے۔ اگر تم میں اخلاقی برتری ہوتی تو اخلاقی ضرورت کا احساس مجبور کرتا کہ تمہیں ملک کی امانت سمجھ کر رکھا جائے، تمہارے دودھ والے پانی ملانے سے پرہیز کرتے، تمہارے درزی کپڑا بچانے کو عیب سمجھتے، تمہارے دستکار اور مزدور محنت سے پورا دن لگ کر کام کرتے، تمہارے حاکم رشوت کو حرام سمجھتے تو دنیا کا کوئی ملک تمہاری جدائی کو گوارا نہ کرتا۔

(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

Regd No. LW/NP 56 Phone 22348 29747

TAMEER-E-HAYAT

Fortnightly

(NADWATUL-ULAMA LUCKNOW-226007 (INDIA)

مجمع بحار الانوار

(احادیث کی مشکلات حل کرنے کے لئے بے نظیر کتاب)

تالیف: ملک المحدثین حضرت شیخ محمد طاہر پٹنی گجراتی (المتوفی ۹۸۶ھ)

اس کتاب کے بارے میں تمام دنیا کے علماء اور ماہرین فن حدیث متفق ہیں کہ یہ اپنے موضوع پر منفرد اور بے نظیر ہے، جو اپنی جامعیت اور فنی خصوصیات کے اعتبار سے اس موضوع پر لکھی گئی تمام کتابوں سے فائق ہے۔ الفاظ حدیث بالخصوص صحاح ستہ کی لغوی مشکلات اور دیگر مباحث کے لئے یہ کتاب گویا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ جس میں لغوی تحقیق اور فنی بحثیں ایسی مبسوط اور مفصل طریقہ پر کی گئی ہیں جو طالب علم کو دوسری کتابوں سے بے نیاز کر دیتی ہے اور مطالعہ کے ذریعہ کی نشاندہی بھی ہو جاتی ہے۔

ہندوستان ہی نہیں بلاد عربیہ کے علماء نے بھی اس کی عظمت اور اہمیت کا غیر معمولی اعتراف کیا ہے۔

یہ کتاب عرصہ سے نایاب تھی، قدر دانوں کی طلب بلکہ ان کے اصرار پر اب خدا کا شکر ہے کہ نہایت آب و تاب اور عربی ٹائپ کی دیدہ زیب طباعت کے ساتھ ۳۴ پونڈ کاغذ پر پہلی بار محترم حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی ... اور محقق لغات مولانا عبدالحفیظ بلیاوی کی تصحیح و تنقیح کے بعد ۵ جلدوں میں دائرۃ المعارف حیدرآباد نے طبع کر کے اہل علم کی دیرینہ آرزو پوری کر دی ہے۔

کتاب کے مجموعی صفحات ساڑھے تین ہزار سے زیادہ ہونے کے باوجود نفع عام اور علم دین کی خدمت کے جذبے سے پوری سیٹ لینے والوں کے لئے اس کا ہدیہ صرف ڈیڑھ سو (۱۵۰) روپئے رکھا گیا ہے۔

ہندوستان میں

مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء پوسٹ بکس ۹۳ لکھنؤ

سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

جعلی بیل، نقلی کیپسول اور ٹین کے ڈھکن سے ہوشیار!

نورانی تیل

درد، زخم، چوٹ، جلنے، کٹنے کی دوا۔

اب سنہرے اور ہرے دو رنگے کیپسول پر ٹریڈ مارک دیکھ کر خریدیے۔

ہندین کیمیکل کمپنی

ہند تیل

تیار کردہ: ہند کی بی ورکس۔ متو ناتھ بھنجن یوپی

تعمیرِ حیات میں اشتہار دیکر اپنی تجارت کو فروغ دیجئے

شربت نزلہ

معمولی کھانسی، زکام اور نزلہ کے لیے

دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

عطر مجموعہ نمبر ۳۹۱۸

حافظ محمد زکریا برادران تاجران عطر و تیل

بہترین چائے کا قابل اعتماد مرکز

عباس علاء الدین اینڈ کمپنی

اسپیشل مکسچر	کپ برانڈ
اسپیشل ممری	گولڈن ڈسٹ
نول مکسچر	فلاور بی او پی

TELEGRAM- CUP, KATTLY

PHONE No 332220

زرِ خریداری اندرونِ ہند مع محصول ڈاک:
سالانہ: ۱۲ روپے ششماہی ساڑھے چھ روپیہ
فی پرچہ: ۳۰ پیسے
بیرونِ ہند مع محصول ڈاک:
بحری ڈاک سے: ایک پاؤنڈ شلنگ
ہوائی ڈاک سے: امریکہ و کناڈا اور
یورپین ممالک: ۳ پونڈ
افریقہ، مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید کے ممالک ۲½ پونڈ
پاکستان: ۳۰ روپے
بنگلہ دیش: ۱۵ روپے

تعمیرِ حیات

لکھنؤ — پندرہ روزہ

شعبۂ تعمیر و ترقی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جلد نمبر ۱۴ | ۱۰ مئی ۱۹۷۷ء — ۲۱ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۷ھ | شمارہ نمبر ۱۳

اسحٰق جلیس ندوی

پاکستان کا سیاسی بحران

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو برصغیر میں ہندوستان و پاکستان کے نام سے دو آزاد مملکتیں وجود میں آئیں۔ ہندوستان میں آزادی ملتے ہی دستور سازی کا کام تیز رفتاری سے ہوتا رہا — اور ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو اپنا دستور بنا کر یہ ملک دنیا کی سب سے بڑی سیکولر جمہوری مملکت قرار پایا اس جمہوری دستور کے تحت ملک میں پہلے عام انتخابات ۱۹۵۲ء میں ہوئے اور ہر پانچ سال بعد مرکز اور ریاستوں میں حق بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر انتخابات ہوتے رہے، امسال ۱۹۷۷ء کا پارلیمانی الیکشن چھٹا الیکشن تھا جس میں اس ملک کے باشندوں نے دنیا کے ترقی یافتہ — اور ترقی پذیر ممالک کے سامنے اپنے پختہ شعور اور جمہوری بالغ نظری کا ایسا ثبوت فراہم کیا جس کی نظیر پارلیمانی جمہوریت کی تاریخ میں برطانیہ کے ۱۹۴۶ء کے ان انتخابات میں ملتی ہے جس میں برطانوی عوام نے دوسری جنگ عظیم کے ہیرو ونسٹن چرچل کی کنزرویٹو پارٹی کو مسترد کر کے لیبر پارٹی اور اس کے سربراہ کلیمنٹ اٹیلی کو اقتدار سونپا تھا۔

پاکستان جس کی بنیاد ایک نظریاتی مملکت پر پڑی تھی، جس کے قائدین حصولِ پاکستان کی جد و جہد میں ایک آزاد اسلامی فلاحی مملکت کی تشکیل کا وعدہ اور نعرہ لے کر مسلم اکثریت کو اپنا ہمنوا بنانے میں کامیاب ہوئے تھے، پاکستان بن جانے کے بعد اپنے وعدوں کو فراموش کر بیٹھے — پاکستان کے دستور کو کتاب و سنت کی روشنی میں بننا تھا، اسلامی دستور کے لئے علمی بنیادیں تیار تھیں لیکن ۱۹۵۶ء تک دستور بن نہ سکا۔ چودھری محمد علی کی وزارتِ عظمیٰ کے زمانہ میں دستور بنا تو اس کے تحت آزادانہ انتخابات کی نوبت نہیں آئی۔ فوج اور سول سروس کے ایک کرپٹ افسر اسکندر مرزا نے صدرِ پاکستان کی حیثیت سے ایسے حالات پیدا کر دئے کہ نہ کوئی مستحکم حکومت قائم ہوتی تھی نہ انتخابات ہوتے تھے۔ آئے دن وزارتیں بدلتی رہیں، دل بدلی ہوتی رہی اور نتیجتاً ۱۹۵۸ء میں جنرل ایوب خاں کی قیادت میں وہ فوجی انقلاب آیا جس نے ۱۹۵۶ء کے دستور کو بھی کالعدم قرار دے دیا۔

ایوب خاں کے دس سالہ دورِ حکومت کے زوال کے بعد جو پہلے عام انتخابات ہوئے اس کے نتیجہ میں بنگلہ دیش وجود میں آیا۔ مغربی پاکستان میں بھٹو صاحب نے اقتدار سنبھالا اور قوم کو وہ دستور دیا جو برائے نام اسلامی دستور تھا۔

وزیر اعظم بھٹو پر حزبِ اختلاف کا یہ الزام ہے کہ پاکستان کے دو ٹکڑے کرنے کی سازش میں اُن کا ہاتھ ہے، انہوں نے جان بوجھ کر سلامتی کونسل میں پیش کردہ اس قرارداد کو پھاڑ دیا جس میں جنگ بندی اور فریقین کے درمیان باہمی گفت و شنید کی تجویز تھی، عین اس وقت جب ڈھاکہ کا سقوط ہونے والا تھا مسٹر بھٹو نے سلامتی کونسل سے واک آؤٹ کیا تاکہ پاکستانی افواج کو ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہے۔

بنگلہ دیش کی علیحدگی کے بعد بچے کھچے پاکستان پر بھٹو اور ان کی پارٹی ۱۹۷۱ء سے برسرِ اقتدار ہے۔ حزبِ اختلاف کا کہنا ہے کہ مسٹر بھٹو کا دورِ اقتدار آمریت، لاقانونیت، غنڈہ گردی، کرپشن، اقربا پروری، جبر و تشدد، آزادیٔ رائے اور اخبارات پر پابندی کے اعتبار سے گذشتہ تمام حکومتوں پر سبقت لے گیا ہے۔

مارچ ۱۹۷۷ء میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے اعلان کے بعد حزبِ اختلاف کی نو جماعتوں میں جو اتحاد ہوا وہ برصغیر کی تاریخ کا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے۔ ان نو جماعتوں میں دیوبندی مکتبِ فکر کی جمعیۃ العلماء اسلام، بریلوی مسلک کی جمعیۃ علمائے پاکستان، جماعتِ اسلامی، خاکسار اور اہلحدیث کے علاوہ بائیں بازو کی کالعدم نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈر اور کارکن، کونسل مسلم لیگ، تحریکِ استقلال پاکستان وغیرہ جماعتیں شامل ہیں۔

کل پاکستان قومی اتحاد نے جب اپنی انتخابی مہم کا آغاز کیا تو عوام نے اس کا زبردست استقبال کیا۔ اپوزیشن کے قومی اتحاد اور بھٹو کی برسرِ اقتدار جماعت پیپلز پارٹی کے جلسے جلوسوں کی نوعیت بالکل وہی تھی جو ہمارے ملک میں برسرِ اقتدار کانگریس اور حزبِ مخالف کی جنتا پارٹی کی تھی۔ قومی اتحاد کے جلسوں اور جلوسوں میں لاکھوں کی تعداد میں لوگ پورے جذبہ اور جوش و خروش سے حصہ لیتے تھے، بھٹو صاحب کی پیپلز پارٹی کے جلسوں اور جلوسوں میں پکڑ کر لائے جاتے تھے۔ ملکی اور غیر ملکی سیاسی مبصرین کا محتاط اندازہ یہ تھا کہ قومی اتحاد اس مرتبہ بھٹو صاحب اور ان کے اقتدار کے لئے بہت بڑے چیلنج کی شکل میں سامنے آیا ہے، لیکن دھن، دھونس اور دھاندلی کا طریقہ اختیار کر کے بھٹو صاحب کی پیپلز پارٹی نے پہلے تو اپنے کئی امیدوار بلا مقابلہ کامیاب کروائے پھر انتخابات میں بھی اسی حکمتِ عملی کو اپنا کر زبردست اکثریت حاصل کر لی۔ پاکستان قومی اتحاد نے ان نتائج کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا اور بھٹو صاحب کو اقتدار سے بےدخل کرنے اور نئے الیکشن کروانے کی مہم ...... شروع کر دی جسے عوام کی زبردست حمایت حاصل ہے

لیکن ابھی یہ کہنا مشکل ہے کہ کون فریق غالب ہوتا ہے۔ بھٹو نے فوج کو اپنی حمایت میں میدان میں اتار دیا ہے، سابق جنرل ٹکا خاں کو کابینہ میں شامل کر کے انہوں نے اپنی قوت میں اضافہ کر لیا ہے۔ اگر اس بحران نے طول پکڑا تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ عوامی جد و جہد اور قومی اتحاد کی کوشش ناکام ہو جائیں۔

پاکستان جان و مال کی زبردست قربانیوں کے بعد اسلام کی ایک تجربہ گاہ کی حیثیت سے دنیا کے نقشہ میں نمودار ہوا تھا لیکن اس کے بانیوں سے لے کر آج تک کے برسرِ اقتدار ٹولے کی بد نیتی اور منافقت کی وجہ سے اسلام ہنوز وہاں مظلوم ہے اور اسلام کے نام لیوا مصیبتوں کا شکار —

اللہ تعالیٰ سے ہماری دعا ہے کہ اسلام کی خاطر کی ہوئی برصغیر کے اسلام دوست عوام کی ان قربانیوں کو نتیجہ خیز بنا دے اور دنیا میں ایک اسلامی فلاحی مملکت اور ایک مثالی اسلامی معاشرہ کو قائم کرنے والوں کی مدد فرمائے۔

کل ہند حلقۂ پیام انسانیت
کا
سہ روزہ کنونشن

بمقام: لکھنؤ بتاریخ: ۲۰، ۲۱، ۲۲ مئی بروز جمعہ، سنیچر، اتوار

اس پتہ پر رابطہ قائم کیجئے:-

کنوینر حلقۂ پیام انسانیت، پوسٹ بکس نمبر ۹۳ ندوہ، لکھنؤ

بڑھ کے خود منزلِ جاناں نے قدم چوم لئے

مولانا محمد احمد صاحب کی مجلس بعد مغرب ۸ دسمبر بروز اتوار بمکان مولانا حکیم ڈاکٹر عبد العلی صاحب ندوی رح

مولانا کی طبیعت دورانِ قیام لکھنؤ مسلسل خراب رہی، بہت ضعف ہو جاتا تھا کہ بات کرنا دشوار ہوتا لیکن اس کے باوجود شفقت و محبت کا یہ عالم کہ تکلیف برداشت کر کے تشریف لے آتے، اور حاضرین کی خاموشی طلب انہیں ساکت نہ رہنے دیتی۔ بے تکلف جوباتِ قلب پر وارد ہوتی اسی سے گفتگو کی ابتدا فرما دیتے۔

فرمایا: اصل چیز محبت ہے، خدا کی محبت پیدا ہو جائے تو پھر سب آسان ہے۔

مولوی عبد اللہ صاحب بستوی نے عرض کیا کہ حضرت خدا تعالیٰ کی محبت کیسے حاصل ہو؟ فرمایا: صرف کوشش کرنا ہمارا کام ہے، پھر تو خود آغوشِ رحمت ہمیں اٹھائے گی۔

بڑھ کے خود منزلِ جاناں نے قدم چوم لئے
تھک کے جب بیٹھ گئے کوشش ناکام کے بعد

فرمایا: دنیا کی محبت اور دنیاوی اغراض کی بنا پر محبت گھٹتی ہے لیکن اللہ کی محبت اور اللہ کے لئے محبت بڑھتی رہتی ہے ومن الناس من یتخذ من دون اللہ انداداً والذین آمنوا اشد حبا للہ۔

جو گھٹتی بھی ہو وہ صحبت نہیں ہے
جو بڑھتی نہ ہو وہ الفت نہیں ہے
محبت، محبت تو کہتے ہیں لیکن
محبت نہیں جس میں شدت نہیں ہے

محبت میں "شدت" نہ ہو تو وہ "اشد حبا للہ" کا مصداق نہیں بن سکتی۔

محبت کے آئین ہیں سب پرانے
خبردار ہاں اس میں جدت نہیں ہے

محبت قدیم شے ہے۔ محبت ازلی و ابدی ہے، محبت کا دستور عاشق کا فعل و کردار ہے، وہ نت نئی رسموں کی پابندی کی متحمل نہیں، سنتِ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پیچھے وچرا عمل ہی محبت ہے، بدعتوں پر عمل کرنا محبت نہیں خواہشِ نفس کا اتباع ہے لہٰذا محبت کے پیدا کرنے اور اس میں قوت ڈالنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے دیگر کی آمیزش سے یکسر اس کا بیمار خالی ہو، اعداء اللہ سے جب نفرت ہوگی تب ہی اللہ سے محبت ہوگی۔

فرمایا: بدعت کے نام سے جب تک نفرت نہ ہو، سنت کی محبت پیدا نہیں ہو سکتی ؎

اس کو مل ہی نہیں سکتا کبھی توحید کا جام
جس کی نظروں سے ہے پوشیدہ رسالت کا مقام

مسکرا کر فرمایا، جگر صاحب کا یہ شعر ہے جو انہوں نے اس وقت کہا تھا جب وہ تائب نہیں ہوئے تھے ؎

سب کو مارا جگر کے شعروں نے
اور جگر کو شراب نے مارا

بعد میں جگر صاحب تائب ہو گئے تھے — بہر حال میں نے یہ شعر پڑھا تو ایک نظم تیار ہو گئی (جس میں بڑے عجیب مضامین دلکش پیرایہ میں بیان میں آ گئے)۔

کمال نے ترے مارا جمال نے مارا
وفورِ شوق نے امرِ محال نے مارا
کبھی خوشی کبھی رنج و ملال نے مارا
کبھی یقین کبھی احتمال نے مارا
کسی کو شورش و مستی و حال نے مارا
مجھے ترے کرمِ بے مثال نے مارا
کبھی جلال برنگِ جمال نے مارا
کبھی جمال برنگِ جلال نے مارا
کسی کو آہ فریبِ کمال نے مارا
میں کیا کہوں مجھے فکرِ مآل نے مارا

مولانا یہ نظم پڑھ رہے تھے اور تاثر و انفعال کا ایک عجیب عالم تھا اور جب آخری شعر پڑھا تو "آہ" ایسی تھی جو جلے کلیجے اور درد مند دل سے نکلی اور ایک تاثر چھوڑ گئی، یہ شعر در اصل مولانا کا حال ہے جو شعر کے حجاب میں جلوۂ مستور دکھانا چاہتا ہے۔ تھوڑی دیر سکوت کے بعد پھر فرمایا:-

میں ایک مرتبہ الٰہ آباد میں بہت بیمار تھا، پلنگ سے اٹھنا دشوار تھا لوگ عیادت کے لئے آتے تھے، میں کمزوری میں اپنے مافی الضمیر کو کیا ادا کرتا، بس اسوقت میری زبان سے یہ اشعار جاری ہوئے ؎

جو چیز تیرے ذوق میں اُف جور و ستم ہے
احساس میں عاشق کے وہی لطف و کرم ہے
ہے تیری خطا اسے سمجھتا تو ستم ہے

از: سید سلمان حسینی ندوی

کیا شئے ہے ستم کچھ بھی ہو ہر حال کرم ہے

فرمایا اس کے بعد والا شعر میں نے بہت سے علماء کے سامنے پڑھا سب نے بہت پسند کیا۔

حاصل جسے اے دوست فیضانِ کرم ہے
دل اس کا کبھی طور کبھی جانِ حرم ہے
ہر زخم میں پوشیدہ ہیں جنت کی بہاریں
عشاق سے پوچھو یہ ستم ہے کہ کرم ہے
کس کی نگہ شوق اسے ڈھونڈ رہی ہے
احساس میں اسکے نہ ستم ہے نہ کرم ہے

فرمایا: ابھی مجلس ہو رہی تھی غالب کا یہ شعر زباں پر آیا ؎

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

— میں نے کہا غالب بھی کتنا نادان ہے عشق سے، حقیقت تو یہ ہے ؎

عشق نے احمد مجلیٰ کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے نام کے

فرمایا: حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کے جہاز پر انتقال ہو جانے کے موقع پر کوشش کی گئی کہ ان کی نعش لے آئی جائے، کوشش کامیاب ہونے والی تھی، لیکن ذرا تاخیر ہو گئی اور بالآخر نعش سمندر میں ڈال دی گئی، اس پر رنج و افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ایک صاحب نے مضمون لکھا تھا اور مضمون کے آخر میں یہ شعر ذکر کیا تھا ؎

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

میں نے کہا اس سے تو ان کی محرومی ظاہر ہو رہی ہے اور یہ ان کی شان کے خلاف ہے۔ میں نے کہا:

جوشِ جنوں میں توڑ دیا میں نے خود کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا
قسمت کی خوبی کہتے ہیں اسکو عزیزِ من
رحمت کے پر سے اُڑ کے سرِ بام آ گیا

فرمایا: اللہ کا عاشق و محب بن جائے تو سارا عالم اسی کا ہو جاتا ہے۔

مقامِ عشق ہے سمجھے گا اسکو راز داں ساقی
ہیں وہ میخوار ہم جس کا ہے اب سارا جہاں ساقی
کوئی اس لطف کو احمد سے پوچھے کوئی کیا جانے
کبھی جاناں ہے ساقی، کبھی ہے پیرِ مغاں ساقی
محبت میں سکون و قرار نہیں ہوتا محبت
عبادت ہے قربانی اور جاں نثاری ہے ؎

محبت ہر نفس آتش بجاں رکھتی ہے عاشق کو
نہیں موقوف بزمِ شمع ہی تک سوزِ پروانہ

فرمایا، چالیس سال پہلے میں نے یہ اشعار کہے تھے اور کل ہردوئی میں گنگنا رہا تھا۔

زباں پر ہے الا اللہ الا اللہ جاری ہے
بس اتنا جانتا ہوں اور کچھ آتا نہیں مجھ کو
ملیں وہ نعمتیں مجھ کو تری ادنیٰ توجہ سے
تکلف برطرف کہتا ہوں خود ہوا آفریں مجھ کو

فرمایا: کسی شاعر نے اپنے شعر میں دل کو جامِ جم سے تشبیہ دی، مجھے یہ تشبیہ پسند نہ آئی، اور اس میں کوئی بلندی نظر نہ آئی تو میں نے کہا ؎

جو دل پر ہم اس کا کرم دیکھتے ہیں
تو ہم دل کو رشکِ ارم دیکھتے ہیں
کرم دیکھتے ہیں، ستم دیکھتے ہیں
محبت کے ساماں بہم دیکھتے ہیں
خوشی دیکھتے ہیں نہ غم دیکھتے ہیں
ہم ان کی نگاہِ کرم دیکھتے ہیں
فیوضِ درِ محترم دیکھتے ہیں
کسے کیا خبر جو ہم دیکھتے ہیں

فرمایا: اس میں تصوف کے عمیق مضامین ہیں، لیکن اصطلاحات کی پیچیدگی سے بالکل محفوظ ہے۔

خوشی کے موقع پر ایک عجیب نظم مولانا نے کہی ہے۔ جو میں پوری نوٹ نہ کر سکا۔ اس کا یہ شعر بلا کی معنویت اور طرزِ ادا کا عجیب اچھوتا پن رکھتا ہے ؎

خوشی کو آگ لگا دی خوشی خوشی میں نے
خوشا نصیب کسی کا ملا مجھے غم ہے

پرنٹر، پبلشر سید محمد حسنی نے
جے۔ کے آفسیٹ پرنٹنگ پریس دھلی میں طبع کرا کر دفتر تعمیر حیات ندوہ لکھنؤ سے شائع کیا۔

اڈیٹر: اسحٰق جلیس ندوی

کتابت: جلال الدین بستوی ندوی

مولانا عبد الماجد دریابادی
نقوش و تاثرات

ڈاکٹر سید احتشام ندوی، پروفیسر و صدر شعبۂ عربی، کالی کٹ یونیورسٹی کیرالہ

مولانا دریابادی کی شخصیت اردو ادب اور اسلامی لٹریچر پر تناور درخت کی طرح چھائی ہوئی ہے۔ مولانا نے اسلامی احساسات وجذبات کو ۶۰ برس تک اردو ادب کے قالب میں ڈھالا ہے۔ وہ ادب، سیاست، اشخاص، واقعات اور کتابوں پر برجستہ تبصرہ کرتے مگر یہ تبصرے درحقیقت ان کے اسلامی احساسات کے عکاس ہوتے تھے۔ مولانا نے ایک عظیم الشان لٹریچر کو جنم دیا ہے جو فلسفہ سے لیکر صحافت تک پر محیط ہے۔ اتنی تہ دار، متنوع وجامع شخصیات مشکل سے وجود میں آتی ہیں۔ مولانا کی شخصیت اس سلسلہ کی کڑی تھی۔

میں جب ۱۹۴۹ء میں ادارہ تعلیمات اسلام لکھنؤ عربی تعلیم کے لئے آیا تو وہاں صدق پابندی سے آتا تھا اس وقت سے برابر صدق پڑھتا رہا اور مولانا سے عقیدت بڑھتی رہی۔ بعد میں چونکہ طبیعت پر دوسرے اثرات مرتب ہوئے اس لئے مولانا عبد الماجد کے خلاف طبیعت میں خیالات اُبلتے رہے۔ خصوصاً ان کی قادیانیوں سے ہمدردی اور کبھی کبھی جماعت اسلامی پر طنز کی وجہ سے۔ ندوہ کی طالب علمی کے زمانے میں مولانا کی خدمت میں ۲۰ صفحات پر مشتمل ایک طویل خط روانہ کیا جس میں لکھا کہ چونکہ آپ کسی مدرسہ کے فارغ نہیں انگریزی سے عربی کی طرف آئے ہیں اس لئے آپ کے اسلامی خیالات میں پختگی نہیں ہے اور آپ کی طبیعت میں ضد ہے۔ بہت کچھ لکھا تھا جب خط پہونچا تو مولانا نے حضرت مولانا علی میاں مدظلہ سے فرمایا کہ پتہ لگائیے کہ یہ خط کس طالب علم نے لکھا ہے۔ چونکہ میں نے بے نام کا خط لکھا تھا لہذا پتہ چلنا آسان نہ تھا۔

پھر جب علامہ سید سلیمان ندوی کی وفات پر ان کی یاد میں ایک عظیم الشان جلسہ ندوہ میں منعقد ہوا تو اس وقت میں نے پہلی بار قریب سے مولانا کو دیکھا۔ وہ بڑے پائنچا کا پائجامہ، کرتا، اور پرے سرخ رنگ کی عبا اور ٹوپی پہنے تھے۔ رنگ سرخ وسفید داڑھی اوسط۔ ظاہر ہے کہ اب سے ۲۵-۲۶ برس قبل اتنے بوڑھے نہیں تھے جتنے آخر میں ہو گئے تھے۔ اسی جلسہ میں مولانا مناظر احسن گیلانی کو بھی دیکھا اور بہت سے اہل علم کی دید سے نگاہیں شاد ہوئیں۔

جامعہ کی طالب علمی کے زمانہ میں مولانا عبد الماجد کا ذکر اکثر مولانا اسلم جیراجپوری سے سنتا تھا بلکہ وہ مجھ سے پوچھتے کہ اس بار مولانا نے کیا لکھا، غرض مولانا کی ذات سے تعلق بڑھتا رہا اور میں نے ان کو خطوط لکھنے شروع کئے۔ بہت سے خط لکھے۔ مختلف موضوعات پر۔ ان میں بعض کو مولانا نے شائع بھی فرما دیا۔

جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ دینیات کی جانب سے ان کو اولڈ بوائز لاج میں پارٹی دی گئی تو اس میں میں بھی حاضر تھا اور مولانا کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا مولانا نے فرمایا آپ تو جامعہ میں تھے اور بڑے دلکش خطوط لکھتے تھے۔ مولانا دوبارہ پھر تشریف لائے تو شعبۂ اسلامیات میں کچھ دیر ٹھہرے اس موقع پر بھی مولانا کی خدمت میں حاضری دی۔ اور ان سے گفتگو کا موقع ملا۔

ونکٹیشور یونیورسٹی تروپتی میں قیام کے بعد سے میں نے صدق میں بہت سے مقالے شائع کرائے۔ مولانا نے اکثر ان پر نوٹ بھی لکھے۔ غالباً میں نے اپریل [illegible]ء میں مولانا سے ملنے کا شوق ظاہر کیا۔ انہوں نے فوراً جواب دیا کہ آپ آنے کی تاریخ کی اطلاع قبل سے کر دیجئے میں لکھنؤ آجاؤں گا۔ چونکہ مولانا کے بھتیجے اور داماد حکیم عبد القوی صاحب لکھنؤ میں مقیم ہیں لہذا مولانا اکثر لکھنؤ آتے جاتے رہتے تھے۔ میں نے لکھا کہ میں مئی میں لکھنؤ آؤں گا اس وقت آپ کو صحیح تاریخ سے مطلع کر دوں گا ــــ چنانچہ میں نے اپنے قیام لکھنؤ کی تاریخ سے مولانا کو مطلع کیا۔ مولانا کا خط آیا کہ میں تو ابھی لکھنؤ سے واپس آیا ہوں۔ اب آپ فلاں تاریخ بارہ بنکی اسٹیشن آجائیے میں بھی وہاں آجاؤں گا ناشتہ ساتھ ہی کریں گے۔

میں ذرا پہلے پہونچ گیا مگر سامنے ہی مولانا کی ٹرین، فوراً مولانا سے ملا، اور دونوں فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں گفتگو کے لئے بیٹھ گئے۔ گفتگو کے موضوعات بہت متنوع تھے (بعد میں مولانا کے ارشادات کو میں نے قلمبند کر لیا) اتنے میں ویٹنگ روم میں کسی نے ریڈیو کھول دیا۔ مولانا بہت چیں بجبیں ہوئے ہم دونوں اٹھ کر ہوٹل چلے گئے۔ اس سے قبل میں بارہ بنکی اسٹیشن پر کبھی نہ تھا۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ ہوٹل ایک مسلمان چلاتا ہے۔ جب میں پیسے دینے لگا تو فرمایا کہ میں نے لکھ دیا تھا کہ ناشتہ میری طرف سے۔ چنانچہ مولانا نے دس کا نوٹ نکال کر دیا۔

میں نے عرض کیا کہ مولانا آپ کا خط میں بالکل نہیں پڑھ پاتا بڑی زحمت ہوتی ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ بات یہ ہے کہ میں بلا دیکھے لکھتا ہوں مگر میری ایک لڑکی میرا خط خوب پڑھ لیتی ہے۔ واقعی آخری دور میں مولانا کا اصل خط لے مبیضہ کے میرے پاس آیا تھا جس کو ان کی صاحبزادی نے صاف کیا تھا مولانا کی آنکھیں کمزور تھیں اس لئے رات میں لکھنے پڑھنے کا کام نہیں کرتے تھے۔

دوران گفتگو ذکر نکلا حکیم عبد القوی صاحب کا میں نے کہا وہ عربی تو نہیں جانتے فرمایا کہ وہ لکھنؤ سے ادیب فاضل کا امتحان عربی میں پاس کر چکے ہیں مولانا سے میں نے عرض کیا تھا کہ ان کی تصانیف کو شائع کرنے اور مقالات کو مرتب کرنے کے لئے ایک اکیڈمی قائم کی جائے اس پر فرمایا کہ میرے اندر بالکل انتظامی صلاحیت نہیں اس سلسلے میں عبد القوی صاحب شاید کچھ کر سکیں۔ فرمایا کہ عبد القوی دریاباد آتے ہیں تو کتابوں سے میری ضرورت کی چیزیں تلاش کر کے مجھے بتا دیتے ہیں۔

مولانا سے ذکر ان کی اہلیہ کا نکلا مولانا نے فرمایا کہ وہ شادی سے قبل ہپناٹزم سے علاج کرتے تھے ان کی عزیزہ بیمار تھیں مولانا نے علاج کیا اور یہی وسیلہ بن گیا شادی کا۔ مولانا کی طرف میں نے دیکھا تو اُن کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ بڑی محبت سے ذکر فرماتے رہے۔

میں نے عرض کیا کہ آپ کا پورے دن کا پروگرام کیا ہوتا ہے فرمایا بس صبح طلوع آفتاب سے قبل اپنے کوٹھے کی چھت پر ٹہل لیتا ہوں پھر صبح سے شام تک لکھتا پڑھتا رہتا ہوں۔ یہ ٹہلنا میل ڈیڑھ میل ضرور ہو جاتا ہوگا۔ فرمایا کہ مکان وسیع ہے، مولانا کو یہ احساس تھا کہ دریاباد اسٹیشن سے قصبہ تک راستہ بہت خراب ہے اسی بنا پر وہ خود لکھنؤ آنا چاہتے تھے۔ بالآخر انہوں نے بارہ بنکی اسٹیشن کا انتخاب فرمایا اگرچہ مجھے احباب سے تکلیف ہوئی کہ مولانا میرے لئے زحمت فرما کر تشریف لائے مگر مولانا کی خواہش کا احترام تھا ورنہ تمنا یہ تھی کہ مولانا کے گھر جا کر ان سے ملتا۔ دوسری ٹرین آنے میں دیر ہوئی لہذا کافی طویل وقفہ مل گیا اور میں نے خوب دل کھول کر گفتگو کی۔ اس زمانہ میں مولانا تفسیر قرآن پر نظر ثانی کر رہے تھے۔ فرمایا کہ وہ صبح سے شام تک اسی میں مشغول رہتے ہیں اور دوپہر کو قیلولہ بھی نہیں فرماتے۔ میں نے عرض کیا کہ عمر کے تقاضہ سے ضعف محسوس فرماتے ہوں گے فرمایا نہیں ابھی تو میں دو تین میل چل سکتا ہوں۔ اس وقت ان کی عمر ۸۰ برس کی تھی۔

مولانا نے فرمایا کہ پہلے انہوں نے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ وتفسیر بائبل کی زبان میں کیا تھا پھر دوبارہ ترجمہ نئے اسلوب میں کیا۔ مولانا نے بتایا کہ پہلے وہ شہر لکھنؤ میں مقیم تھے مگر وہاں کے جلسے جلوس دعوتیں اور ملاقات کرنے والوں کا ہجوم ان باتوں سے گھبرا کر یکسوئی کے لئے اپنے گھر چلے گئے۔

مولانا کے ساتھ جتنی دیر رہا خیالات متموج رہے۔ ان کی ذات میں علامہ شبلی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا آزاد اور دوسرے بزرگوں کے نقوش ذہن میں اُبھرتے رہے۔ اچانک مولانا نے فرمایا آپ مولانا عبد الباری صاحب سے نہیں ملے؟ میں نے کہا نہیں۔ فرمایا ملئے۔

مولانا کی ذات سراپا صفات تھی۔ انہوں نے جم کر علمی وادبی کام کئے پوری عمر ایک ہی دھن میں گذار دی۔ ان کی ذات خود ایک انجمن تھی۔ اگرچہ وہ اور مولانا ابو الکلام آزاد دونوں باضابطہ ندوی نہ تھے مگر دونوں نے علامہ شبلی سے فیض حاصل کیا تھا۔ اور شبلی اسکول کے اہم ارکان میں تھے۔ ان کا ہفتہ وار "صدق" ندوہ کا محافظ اور حامی تھا۔ ان کے ادبی پہلو پر میں نے ایک الگ مقالہ تحریر کیا ہے، اس لئے یہاں صرف ان پہلوؤں کو اجاگر کرنا چاہتا ہوں جن کا علم مجھے ذاتی طور پر ہے۔

میں نے مولانا سے دریافت کیا کہ آپ قدوائی ہیں؟ فرمایا ہاں میں کھرا قدوائی ہوں البتہ لکھا صرف ایک بار ہے (جب کہ رفیع احمد قدوائی پر مقالہ تحریر کیا تھا اس وقت نام کے ساتھ عبد الماجد قدوائی چھپا تھا۔

لوگ شاکی ہیں کہ مولانا غلو پسند تھے متقشف تھے مگر میں نے تو مولانا کو بڑا دلکش و دلچسپ انسان پایا۔ خیالات میں

تعلیماتِ نبوی کی روشنی میں بچوں کی تربیت

مفتون کوٹوی

یہ بات تو ہم سبھی جانتے ہیں کہ بچے قوم ومعاشرہ کی بنیاد ہیں ان کی صحیح تربیت سے ملت وملک اور قوم ومعاشرہ چمک اٹھتا ہے اور ان کی غلط تربیت سے گرد آلود ہو جاتا ہے۔ آج کا بیٹا کل کا باپ، آج کی بیٹی کل کی ماں اور آج کا بچہ کل کا بزرگ بن کر ملک وملت کی ذمہ داریاں سنبھالے گا۔ آج جسے ہم کسی توجہ کے لائق نہیں سمجھتے کل وہی ہماری تمام تر توجہات کا مرکز بنیگا۔ ہمارے مقاصد حیات اور اغراض زندگی کی تکمیل وبقا آئندہ نسلوں کے شاندار مستقبل پر انحصار رکھتی ہے، ہر عورت کی فطرت میں ماں بننے کی خواہش ہوتی ہے اور خدا کا ہزار ہزار شکر ادا کیا جانا چاہئے اگر وہ ماں بنا دی جائے لیکن ساتھ ہی اس مسرت و شادمانی میں اُن ذمہ داریوں کو نہیں بھولنا چاہئے جو اولاد کی پیدائش کے بعد والدین پر عائد ہوتی ہیں۔

ماہرین نفسیات نے اور مذہبی رہنماؤں نے اس سلسلے میں ہماری بے حد رہنمائیاں کی ہیں اور انہیں ذہن میں رکھئے تو یہ مرحلہ سر کی صورت میں والدین سے کئی قربانیاں چاہتا ہے۔ مالی قربانی، وقت کی قربانی، توجہات کی قربانی، اپنے مشاغل کی قربانی اور اپنے نجی شوق کی قربانی۔ اپنی روزمرہ کی زندگی میں اتنی احتیاط اور بردباری برتنی چاہئے کہ بچہ اس آئینے میں خود ایک تابناک عکس اور ضیا پاش تجلی بن جائے، ماحول ایسا پاکیزہ وپاکباز بنا لینا چاہئے کہ بچوں تک بدکرداریوں اور بدگفتاریوں کی ہوا بھی نہ پہونچے کیونکہ بچہ سادہ کتاب ہوتا ہے جو نقوش آپ اس میں بنائیں گے وہی اسکی زیب وزینت بنیں گے۔ اُن سے بدعہدی نہ کیجئے، جھوٹا وعدہ نہ کیجئے، انہیں دھوکا نہ دیجئے۔ اگر آپ اُن کی زبان سے آپ اور جناب سننا چاہتے ہیں تو خود اُن سے آپ اور جناب کہئے۔ وہ آپ کو بیڑی سگریٹ پیتا دیکھیں گے تو خود بھی اس کی نقل کریں گے آپ کو بیٹھ کر تین سانسوں میں ٹھہر ٹھہر کر پانی پیتا ہوا دیکھیں گے تو وہ خود بھی بیٹھ کر اور ٹھہر کر پانی پئیں گے۔

جن گھروں میں وضو کیا جاتا ہے نمازیں پڑھی جاتی ہیں اور روزے رکھے جاتے ہیں، بچے بھی بغیر کسی ہدایت وتربیت کے اولاً ان امور کی نقل کرتے ہیں پھر اپنے ذہنوں اور دماغوں میں ایسا ماحول بسا کر ابتدائے عمر ہی سے ان پر عمل پیرائی شروع کر دیتے ہیں اور اُس عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی جب انہیں نماز پر ڈانٹ ڈپٹ اور زدوکوب کا حکم ہے وہ اعمال حسنہ کے پابند اور نیک کاموں پر کاربند ہو جاتے ہیں۔ انہیں چیل کوّے کبوتر اور چڑے کی کہانیوں کے بجائے ہمارے دینی اسلاف اور اسلامی بزرگوں کے واقعات سنائے جائیں، تو بچپن ہی سے اُن کے حافظے اور یادداشت میں کہیں حضرت عمرؓ جلوہ پاش نظر آئیں گے اور کہیں حضرت خالدؓ۔ کہیں محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی واقعات کی تابانیاں جلوہ گر ہوں گی۔ تو کہیں صحابیات کے ایمان افروز کارنامے۔ تاہم یہ سب والدین کی توجہات اور تعلیمات ہی سے ممکن ہو سکتا ہے جو ہمارا انسانی، اخلاقی اور معاشرتی فرض ہے لیکن قربان جائیے اسلام کی گیرائی اور گہرائی، وسعت وبصیرت اور رحمت و رافت پر کہ اس فرض کی تکمیل بھی عبادت واطاعت کے دائرہ میں شامل کر کے انعامات دنیوی کے ساتھ انعامات اُخروی کا بھی مستحق قرار دے دیا گیا ہے اور ایسے والدین کو گلزار جنت کے نعائم کا حقدار گردانا گیا ہے۔ عرب میں طلوع اسلام سے قبل لڑکیوں کی حالت قابل رحم تھی تو خصوصاً لڑکیوں کی تربیت وتعلیم کے مواعید زیادہ پُرکشش رکھے گئے ہیں۔ دو یا تین لڑکیوں کی پرورش پر حضورؐ نے باغ فردوس میں اپنی ہمسائیگی کا شرف بخشنے کی بشارت دی ہے۔

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دامن تربیت میں حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کو لے کر انہیں چھوٹے سے بڑا کر کے اور بچپن سے جوانی تک اپنی نگرانی میں ان کی تربیت وتعلیم کر کے پیروان اسلام کے لئے بہت سی راہیں کھول دی ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اُن نسلوں کو پروان چڑھایا جنہوں نے مدتوں تحفظ اسلامی اور دبدبۂ اسلامی کا پرچم شرق وغرب اور ایشیا ویورپ میں بلند وبرقرار رکھا۔ شادی بیاہ کے معاملات، جہیز نکاح ومہر پھر اس کے بعد شوہر کے گھر اور خسرال کے یہاں کی زندگی کو خوشگوار وپائیدار بنائے رکھنے کے اصول ورموز سے متعلق ان دینی میں حضورؐ اور اُن کے صحابۂ کرام کی حیات وتوجہات ہی سے آگاہ، باخبر اور بابصیرت ہو سکے۔ حضرت فاطمہؓ کو کتنا مختصر جہیز دیا گیا اور آج کل کے "ملک" اور جہیز کی گراں باری اور لڑکے والوں کی فرمائشوں کا کس طرح استقبال کیا گیا۔ بدنصیبی ہماری ہے اگر ہم نسخۂ کیمیا کے ہوتے ہوئے ناکام ونامراد رہیں۔ پامال وبرباد ہوا کریں۔ شادی بیاہ میں ہزاروں غیر اسلامی مراسم کو رواج دے دیں۔ اور اُن کی پابندی اصول شرعی پر مرجح رکھیں۔ شادی ہی پر کیا منحصر ہے غمی بھی۔ زندگی ہی کیا موت بھی انہیں غیر شرعی رسوم کے تلے دبی ہوئی ہے اور انسانیت سسک رہی ہے، کچلی جا رہی ہے۔ ان کے لئے اصلاحیں کی جا رہی ہیں قوانین بنائے جا رہے ہیں لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ جتنے قانون بنتے ہیں اتنے ہی قانون شکنیوں کے طور وطریق گھڑ لے جاتے ہیں غضب تو یہ ہے کہ وہ قوم بھی اُن آندھیوں، طوفانوں اور بربادیوں کا شکار ہے جو خود کو حامل دین متین، اور صاحب قرآن مبین کہلاتی ہے جس کے سامنے علم وتعلیم ہی کے نہیں، عمل وکردار کے بھی ہزاروں نمونے ہیں۔ اک ذرا سی جرأت وحوصلہ کی ضرورت ہے، اپنے خول سے اپنے جال سے اور اپنے غلاف سے باہر نکلنے کے لئے۔ افسوس یہ ہے کہ یہ جال اور جالے ہمارے گرد ایسے تنے ہوئے ہیں کہ ہم ان رسموں اور رواجوں سے باہر نکل نہیں پاتے۔ دینی تعلیم سے غفلت کا یہ ثمرہ ہے یا عملی حیثیت سے خود کو بے حس وبے بس سمجھ کر غلط دھارے کے رحم وکرم پر اپنے آپ کو سپرد کر دینے کا نتیجہ ہے۔

وہ لڑکیاں جو ہمارے لئے نعمت ورحمت ہیں، ہماری نظر میں آفت ووبال بن گئی ہیں جن بچوں کے لئے ارشاد ہوا ہے "الولد ملئی وریحان اللّٰہ" کہ بچے خدا کے باغ کے پھول ہیں، وہ مصیبت وعذاب سمجھے جانے لگے ہیں بچوں سے شفقت ومحبت کی نعمت ان کی صورت عادت سے لطف اندوزی، اُن گفتگو سے استفادہ اور پھر اُن کی تربیت وتعلیم پرورش وآسائش کے سلسلے میں متعلقین کی قربانی۔ اس کے صلہ میں عبادت وثواب کا حکم۔ دین اسلام کی کتنی برکتیں اور رحمتیں ہیں۔ جن سے محرومی ــــ بدنصیبی ہے اور جن کی محرومی بڑا خسارہ ہے، ہمارے شب وروز پر شرعی انوار اور مذہبی اطوار جلوہ فگن ہو جائیں تو نظریں پُرضیا اور قلوب مجلّیٰ ہو سکتے ہیں، جس بچہ کے کانوں میں ابتدا ہی سے اذان واقامت کی آواز پڑ جائے تو وہ شریعت ومذہب کے بال وپر سے آشنا اور اُڑان اختیار کر کے خود اپنے لئے بھی برکت ورحمت بن سکتا ہے، اور اپنے والدین کے لئے بھی اور اپنے معاشرہ کے لئے بھی۔

بات اصل میں یہ ہے کہ ــــ بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست۔ ہمارا یقین ہونا چاہئے کہ قرآنی تعلیمات اور حیات بابرکات میں ہر مشکل کا حل موجود ہے خواہ وہ الجھن عارضی ہو یا دائمی ــ ہنگامی ہو یا دوامی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا کردہ علم وعمل ہمارے ہر پہلوئے حیات کو محیط ومشتمل ہے۔ بچوں کی حیثیت بھی حضورؐ کے کردار وگفتار میں پرکھئے ــــ

حضرت حلیمہؓ، حضورؐ کی دودھ پلائی تھیں جو قبیلہ سعد سے تعلق رکھتی تھیں، وہی قبیلہ سعد جس کے متعلق حضورؐ فخر سے فرماتے تھے کہ میری لسانی تربیت خود اللہ عزوجل نے فرمائی ہے اور میرے ذوق ادب کو خوشتر بنا دیا ہے، میں نے قبیلہ سعد کی فصاحت آمیز فضا میں پرورش پائی ہے۔ آپ کی دودھ شریک بہن حضرت شیما تھیں اُن کے گاؤں میں اسلامی فوج سے لڑائی ہوئی تو جنگی قیدیوں میں یہ بھی گرفتار ہو کر آئیں، فوجیوں نے آپؐ کے روبرو یہ کہہ کر پیش کیا کہ یہ آپؐ کو اپنا دودھ شریک بھائی بتاتی ہیں، آپؐ نے پہچانا تو آنسو بھر لائے۔ آگے بیٹھنے کو اپنی چادر بچھا دی۔ فرمایا تم چاہو تو بھائی کے پاس رہو اور چاہو تو اپنے گاؤں چلی جاؤ، اُن کی خواہش پر انہیں بڑے احترام سے اونٹ اور بکریاں دے کر واپس بھیج دیا۔

دودھ شریک بہن کی محبت کے بعد بیٹے اور بیٹی کی محبت بھی مثالی اور منفرد رکھتی ہے۔ جناب ابراہیم کو رضاعت کے لئے مدینہ کے بالائی حصہ میں رکھا گیا تھا آپ کافی فاصلہ طے کر کے وہاں تشریف لے جاتے گھر میں دھواں بھرا ہوتا لیکن آپؐ بچہ کو گود میں لے کر پیار کرتے۔

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

وائے سانحہ ارتحال مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ

سنہ ۱۳۹۷ھ

از: مولانا ابو المعارف شاد عظمی مدرس مدرسہ اشرفیہ تعلیم الاسلام شبیہہ (بارہ بنکی)

گلشن علم و فن ہوا برباد — ہو گیا گل چراغ دریاباد
زندہ دل زندہ دار تھے ماجد — دار عقبیٰ میں ہو گئے آباد
تھے یہ بی۔ اے مگر بجنِ طلب — عربی و فارسی کے تھے استاد
تھے فہیم و ذکی و متواضع — دل نہیں ان کے بسا تھا خلد آباد
تھی عجیب و غریب یہ ہستی — تھے یہ نقاد و جامع اضداد
صدق کے وہ مدیر دانشور — دار فانی سے ہو گئے آزاد
سن یہ ستانوے و تیرہ سو — ہم سبھی کو اب ہو گیا ہے یاد
از دلِ شاد عیسوی سن ہے — شفق تاریخ دیکھ لو۔ اے شاد
۱۹۷۷ء

عبد ماجد جوارِ رحمت میں
شاد لکھ دو کہ ہو گئے تھے

غزل

سید طفیل احمد مدنی، لکچرر شعبۂ عربی و فارسی الٰہ آباد یونیورسٹی۔ الٰہ آباد

لاکھ حائل ہوئیں ظلمتیں راہ میں سینۂ شب مگر چیر کر آئے ہیں
ہم ہی تو ہیں نقیب اس نئی صبح کے ہم ہی لے کر نوید سحر آئے ہیں
آپ کی انجمن کے شایانِ شاں لے کے نذرانہ خوب تر آئے ہیں
آپ کی یاد سے جگمگاتا ہوا لے کے ہم اک دلِ معتبر آئے ہیں
مست نظروں سے اپنی انہیں بھی ذرا مست و سرشار کر دے خدا کے لئے
ساقیا تیری محفل میں کچھ تشنہ لب با دلِ خستہ با چشم تر آئے ہیں
اُف وہ انوار کی بارش الاماں چشم بینا میں بھی خیرگی آگئی
میں یہ سمجھا کہ جیسے تری بزم میں چاند تارے فلک سے اتر آئے ہیں
خالی دامن نہ لوٹے بفضل خدا ہم کبھی معدنِ عشق و عرفان سے
ان کی محفل سے جب بھی اٹھے دوستو بھر کے دامن میں لعل و گہر آئے ہیں
میرا پندار ٹوٹا تو اگر ہیں چوٹ کھائی جو دل پر تو وہ بھی یہیں
مل نہ پائی یہ لذت مجھے اور کہیں راہ میں کتنے ہی بام و در آئے ہیں
یہ مرا انتخابِ نظر ہی تو ہے جس نے دنیا میں بس اک تمہیں کو چنا
ورنہ اس عالمِ رنگ و بو میں تو یوں ایک سے ایک شمس و قمر آئے ہیں
آج احساسِ غم بھی زیادہ نہیں زخمِ دل بھی کسی نے کریدا نہیں
پھر بھی بیٹھے بٹھائے خدا جانے کیوں خود بخود اشک آنکھوں میں بھر آئے ہیں
چند آنسو اور اک سجدۂ بے ریا اور ترے عاشقوں کی خصوصی دعا
دار فانی سے اے داورِ حشر ہم بس یہی لے کے زادِ سفر آئے ہیں
دشمنوں کی عداوت کا کیا ذکر ہے حق کی خاطر زباں جب بھی کھولی گئی
دوستوں کی صفیں تھیں کھڑی جس طرف سنگ اسی سمت سے بیشتر آئے ہیں
عہد حاضر کی تہذیب پر تبصرہ آپ بتلایئے کس زباں سے کروں
شرم سے جھک گئی ہیں نگاہیں جہاں ایسے بھی کچھ مناظر نظر آئے ہیں
خونِ دل سے چمن سینچتے ہی رہے خدمتِ گلستاں میں لگے ہی رہے
گرچہ کتنے ہی الزام اس راہ میں مستقل اے طفیل اپنے سر آئے ہیں

پتہ صاف اور مکمل لکھا کریں۔

بقیہ صفحہ ... نقوش و تاثرات

بھی اعتدال نظر آیا۔ فرمانے لگے کہ لوگ تعریف کر کے بڑا اجر کم کرتے ہیں اور غلط فہمی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

تصوف کا ذکر نکلا تو کہنے لگے کہ تصوف کو اسقدر پیچیدہ بنا دیا گیا ہے کہ پورا ایک نظام بن گیا حالانکہ یہ مقصود نہیں۔

مولانا اس درمیان چونکہ قرآن مجید پر کام کر رہے تھے ذکر نکلا معجزہ شق القمر کا۔ مولانا نے فرمایا کہ اگر چاند دو ٹکڑے ہو گیا ہوتا تو سارے عالم میں دیکھ پڑتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقتربت الساعۃ وانشق القمر سے مراد ہے القمر۔ قرب قیامت ایسا ہونے والا ہے۔

مولانا نے فرمایا کہ انہوں نے مولانا ظفر الملک کے ساتھ مل کر ہفتہ وار "سچ" جاری کیا پھر مولانا اور ظفر الملک میں اختلافات ہو گئے اور انہوں نے اپنا رسالہ "صدق" کے نام سے جاری کیا۔ پھر بولے کہ ظفر الملک کیساتھ اکثر لوگوں کو اختلافات پیدا ہو جاتے تھے۔

ندوہ کے جشن بہاراں میں نومبر ۱۹۷۵ء میں ندوہ کے مہمان خانے کے باہر ہم لوگ بیٹھے تھے کہ ایک کار آکر رکی دیکھا تو مولانا عبدالماجد دریابادی تشریف فرما ہیں مگر ضعف و اضمحلال کا یہ عالم تھا کہ دو آدمیوں نے سہارا دیا تو مولانا باہر نکلے۔ میں نے جا کر سلام کیا۔ مولانا مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے مصافحہ کیا۔ چہرہ پر زردی تھی رنگ نکھر گیا تھا۔ بلکہ چہرہ بقعۂ نور بن گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ عمر کا پیمانہ تو محدود ہے۔ اس محدود و مختصر مدت میں انسان کو اسکے اعمال سے ناپا جا سکتا ہے۔

مولانا نے اپنے گاؤں میں جس طرح بیٹھ کر علم و ادب، دین و ثقافت کی خدمت کی ہے۔ زبان و اسلوب کے جس طرح جلوے دکھائے ہیں اردو صحافت کو جس طرح نکھارا اور سنوارا ہے۔ حسن طنز نگاری کو جس طرح آگے بڑھایا ہے اور فکر و فن کا جس طرح مظاہرہ کیا ہے وہ اردو اور اسلامیات کے موضوعات پر حیات ابدی بخشنے کے لئے کافی ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

بقیہ صفحہ ۵ تعلیمات نبوی ...

حضرت فاطمہؓ کو اپنی جان کا ٹکڑا فرمایا۔ اُن کے رنج سے خود رنجیدہ ہوتے وہ آتیں تو اُٹھ کر استقبال کرتے۔ بڑی شفقت سے پاس بٹھاتے۔ سفر پر تشریف لے جاتے تو آپ سے مل کر جاتے۔ واپس تشریف لاتے تو مسجد میں دو رکعت نفل پڑھ کر ان کے گھر تشریف لے جاتے۔ تسبیح فاطمہؓ حضرت فاطمہؓ کو بیش قیمت عطیہ کے ساتھ امت کو بھی گراں قدر انعام ہے جو ہمارے صحابہ کرام اور اولیائے عظام کے اکثر و بیشتر معمول میں رہی ہے اور جس کا فیض آج بھی ہر عامل کو پہونچتا ہے۔

اُن کے صاحبزادوں حضرات حسنینؓ سے بہت پیار کرتے، اُن کو کندھوں پر سوار کرتے۔ اُن کے لئے گھوڑا بنتے وہ عنان کے طور پر آپ کے گیسوئے مبارک پکڑ لیتے۔ حالت نماز میں بھی انہیں کندھوں پر بیٹھے دیتے۔ سجدہ کو طویل فرما دیتے کتاب "محسن انسانیت" (از نعیم صدیقی) میں ایک واقعہ کا ذکر ہے کہ ایک بار اقرع بن حابس نے آپ کو جناب حسنؓ کا بوسہ لیتے دیکھا تو تعجب سے کہا کہ میرے تو دس بیٹے ہیں میں نے کبھی کسی کو پیار نہیں کیا اگر آپ بوسہ لیتے ہیں۔ فرمایا جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

عبداللہ بن بشیر کے ہاتھ ان کی والدہ نے ہدیہ کے طور پر انگور حضورؐ کی خدمت میں بھیجے۔ صاحبزادہ میاں راستے میں چٹ کر گئے بعد میں معاملہ کھلا تو آپ پیار سے عبداللہ کا کان پکڑ کر کہتے یا غدر یا غدر۔ او دھوکے باز، دھوکے باز۔

حضرت انسؓ کو کبھی پیار سے کہا، یا ذا الأذنين۔ او دو کانوں والے حضورؐ بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرتے۔ پیار کرتے۔ دعا فرماتے۔ ننھے بچے لائے جاتے تو ان کو گود میں لے لیتے۔ سفر سے آرہے ہوتے تو جو بچہ راستے میں ملتا اسے سواری پر بٹھا لیتے۔ چھوٹا ہوتا تو آگے۔ بڑا ہوتا تو پیچھے۔ فصل کا میوہ پہلی بار آتا تو دعائے برکت مانگ کر کم عمر بچوں کو دے دیتے۔

اس محبت و تربیت سے پلی بڑھی اولاد کیوں نہ اچھی شہری بنے گی۔ یہ نسل کیوں نہ قوم و ملک کے لئے مفید ثابت ہوگی۔ یہ بچے کیوں نہ دین و مذہب کی توانائی و تابانی کا سبب ہوں گے۔

صلوا علیه وآله۔

بنگلور میں

"جامعہ فرقانیہ" کے قیام کا منصوبہ

جنوبی ہند میں ندوۃ العلماء کی ایک شاخ

از: محمد شہاب الدین ندوی۔ ناظم فرقانیہ اکیڈمی بنگلور

واقعہ یہ ہے کہ آج مسلمان اپنی نوخیز نسلوں کی صحیح اور جامع تعلیم کے بارے میں حیران و سرگرداں نظر آتے ہیں۔ کیونکہ آج ہماری درسگاہیں اور مدرسے دو طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک طرف عربی دینی مدرسے ہیں جو اسلامی تہذیب و کلچر کے علمبردار ہیں تو دوسری طرف انگریزی کالج ہیں جو نئے علوم کے نمائندہ ہیں۔ اور بدقسمتی سے ان دونوں میں کوئی ربط و تعاون موجود نہیں ہے۔ یہ دونوں طبقے حالات سے بے خبر اور ایک دوسرے کے لئے اجنبی دکھائی دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ہر مسلمان متحیر ہے کہ وہ اپنے لخت جگر کو کس کے حوالے کرے؟ اگر دین کا خیال کرتا ہے تو اس کی نظروں میں دنیا فوت ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور اگر دنیا کا خیال کرتا ہے تو دین چھوٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ لہٰذا وہ ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے اور یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ اس کو کیا کرنا چاہیے؟ کیونکہ بدقسمتی سے ہمارے ہاں ایسے مدارس موجود نہیں ہیں جو قدیم و جدید دونوں علوم کے جامع ہوں اگر ہوتا یہ ہے کہ مالدار اور ذہین بچے زیادہ تر انگریزی مدارس کے حوالے کر دئے جاتے ہیں اور عربی مدارس کے حصے میں نادار اور کم ذہین بچے آتے ہیں۔ دین و دنیا کی اس تفریق سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہونچ رہا ہے۔ اور یہ دونوں طبقے دو متحارب کیمپوں میں بٹے ہوئے ایک دوسرے کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

جب تک تعلیم کی یہ دوئی ختم نہیں ہوتی مسلم معاشرہ حقیقتاً کوئی قابل قدر ترقی نہیں کر سکتا اور نہ وہ زندگی کے میدان میں ایسے قابل افراد کو لا سکتا ہے جو موجودہ حالات کو سمجھیں اور نئے مسائل اور جدید تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے معاشرے کی تعمیر نو کر سکیں اور زندگی کے ہر شعبے میں نئے سرے سے اصلاح کر کے ایک ہمہ گیر انقلاب برپا کر سکیں تا کہ موجودہ سائنٹفک دور میں مسلم قوم۔ سارا عالم اسلام۔ بھی دیگر ترقی یافتہ اقوام کے شانہ بشانہ کھڑا ہو سکے۔ ہمارے ایک ہاتھ میں قرآن و حدیث ہوں تو دوسرے ہاتھ میں علوم و فنون ہوں۔ ہم کو ان دونوں میں ایک توازن قائم کر کے افراط و تفریط سے بچنا چاہیے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جس طرح عربی زبان قرآن و حدیث کے علوم و معارف کی کنجی ہے۔ جس کی تحصیل کے بغیر اسلام کے صحیح منشا، اور اس کے ذہن و مزاج کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا ممکن نہیں، بالکل اسی طرح انگریزی زبان تمام علوم جدیدہ کی چابی ہے، جس کو حاصل کئے بغیر جدید علوم اور جدید فلسفوں کے رموز و اسرار پر عبور حاصل کرنا ممکن نہیں۔ مگر افسوس کیساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے تعلیمی ادارے حالات سے بے خبر اور ایک دوسرے سے بے نیاز چلے جا رہے ہیں۔ ایک طرف عربی مدرسوں میں زیادہ تر تین سو سال پرانا نصاب تعلیم رائج ہے، جو جدید تقاضوں سے مطابقت نہیں رکھتا اور دوسری طرف ہمارے کالج ہیں جو انگریزی دور کی نشانی اور محض کلرک ڈھالنے کی مشین نظر آتے ہیں اگر بالاستثناء ہمارے کسی کالج میں دینیات کی کچھ تعلیم ہوتی ہے یا کسی عربی مدرسے میں نئے علوم کی کچھ بو باس پائی بھی جاتی ہے تو اس کی حالت ناگفتہ بہ ہے اور اس بارے میں بہت زیادہ افراط و تفریط سے کام لیا جا رہا ہے، نصاب تعلیم اگرچہ کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو، جب تک پورے اخلاص کے ساتھ اس پر عمل نہ کیا جائے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔

اس سلسلے میں دونوں طبقوں کے درمیان کچھ غلط فہمیاں اور بے بنیاد اندیشے پائے جاتے ہیں، جس کی وجہ سے یہ دونوں دھارے الگ ہی الگ بہہ رہے ہیں۔ عصر جدید کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایک جامع اور متوازن نظام تعلیم اپنایا جائے اور پیش پا افتادہ جدید مسائل کو حل کیا جائے اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ قیامت تک تمام اقوام عالم کی اصلاح و رہنمائی کے لئے امت مسلمہ ہی ذمہ دار بنائی گئی ہے اور اس کے کندھوں پر اصلاح عالم کا بار ڈالا گیا ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے:۔

"کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر"

تم بہترین امت ہو جو لوگوں (پوری نوع انسانی) کے لئے تیار کی گئی ہے۔ (تمہاری ڈیوٹی یہ ہے کہ) تم انہیں معروف (جانی پہچانی حقیقت) کی تلقین کرتے رہو اور منکر (امانتناس) سے روکتے ہو۔

اس فرمان خداوندی کا تقاضا ہے کہ ہم ایک ایسی جماعت پیدا کریں جو موجودہ معاشرہ کے ہر نقص کو دور کر سکے، معاشرہ کے ہر طبقے اور ہر خانے میں گھس کر اس کی اصلاح کر سکے ہر علم و فن کے خیر و شر کو علیحدہ علیحدہ کر سکے اور ایک ہمہ گیر انقلاب برپا کر کے پورے عالم انسانی کے سدھار کا کام کر سکے۔ مگر یہ کام اُسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ ہم تمام مروجہ علوم و فنون کا جائزہ لیں، اقوام عالم کے عروج و زوال پر نگاہ رکھیں، معاشرتی (سوشل) علوم کا مطالعہ کریں اور مختلف معاشروں اور سوسائٹیوں کی ایک ایک ادا کو نظر میں رکھیں۔

اس کام کے لئے ایک ہمہ گیر منصوبے کی ضرورت ہے اور نئے کیل کانٹوں اور نئے ہتھیاروں سے لیس ایک فوج درکار ہے۔ مگر یہ کام اُس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا، جب تک کہ موجودہ نظام تعلیم کو بدلا نہ جائے اور جدید تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسے جامع مدرسے اور کالج قائم نہ کئے جائیں جو بیک وقت اخلاقی تربیت گاہیں بھی ہوں اور دینی و دنیوی علوم کے جامع مراکز بھی۔ موجودہ حالات میں عصری علوم کی اہمیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہم جدید علوم سے واقفیت حاصل کئے بغیر مذہب اسلام کا صحیح دفاع نہیں کر سکتے اور نہ ان علوم کی جانب سے مذہب پر وارد ہونے والے اعتراضات کا جواب دے سکتے ہیں۔ جدید افکار و نظریات سے واقفیت ہر دور میں ضروری ہے۔ اس کے بغیر نیا علم کلام وجود میں نہیں آسکتا اور اقوام عالم پر فکری و نظریاتی اعتبار سے فتح پوری نہیں ہو سکتی۔

"ندوۃ العلماء" کی تقلید کی ضرورت:

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ہندوستان کا وہ مایہ ناز مدرسہ ہے جس نے اس سلسلے میں دلیرانہ اقدام کر کے ایک اچھی مثال قائم کر دی ہے۔ جس کے نصاب تعلیم میں اسلامی علوم کے پہلو بہ پہلو عصری علوم کو بھی بڑی فراخدلی کے ساتھ جگہ دی گئی ہے یہ مدرسہ سالہا سال سے مسلسل تجربات کر رہا ہے جسکے نتائج کافی حوصلہ افزا ہیں ہمارے عربی و اسلامی مدرسوں کو زمانے کے مزاج اور اسکے تقاضوں کے پیش نظر ندوۃ العلماء کی فوری تقلید کرنی چاہیے، تا کہ عالم انسانی کی قیادت زیادہ بہتر اور زیادہ صحیح طور پر ہو سکے۔ اس وقت ہم کو اسلامی اقدار کے دفاع کے لئے ہر قسم کے عصری ہتھیاروں سے مسلح ہونے کی ضرورت ہے، ہمارے موجودہ نصاب تعلیم سے بعض غیر ضروری اجزاء کو خارج کر کے جدید نئے اور مفید علوم کو شامل کیا جا سکے اور ایسے مدرسے اور کالج زیادہ سے زیادہ تعداد میں قائم کئے جائیں جن میں عربی و انگریزی دونوں کی تعلیم مساویانہ طور پر دی جاتی ہو۔ اس انقلابی اقدام کے بغیر موجودہ مسائل حل نہیں ہو سکتے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہماری علمی زندگی سے علیحدگی اور پیش پا افتادہ مسائل سے مسلسل گریز و فرار کے باعث نہ صرف علماء پر حرف آرہا ہے، بلکہ اسلام بھی طنز و تعریض سے بچ نہیں سکا ہے۔ حالانکہ وہ ایک مکمل اور ابدی دین ہونے کا داعی و علمبردار ہے جو دین اپنے دائمی اور ابدی ہونے کا مدعی ہو اور ہر زمانے کے حالات اور تقاضوں سے نپٹنے کا دعویٰ رکھتا ہو، اس کے پیرو نئے علوم اور نئے مسائل سے ناآشنا رہ کر اُس کی برتری کس طرح ثابت کر سکتے ہیں؟ اور عصری حالات اور تقاضوں کو سمجھے بغیر موجودہ علمی و تہذیبی مسائل کس طرح حل کر سکتے ہیں؟

ندوۃ العلماء کی جنوبی شاخ:

اسی نظریہ اور مقصد کے تحت ہم جنوبی ہند کے مرکزی شہر بنگلور میں "جامعہ فرقانیہ" کے نام سے ایک عربی مدرسہ قائم کرنا چاہتے ہیں جو انشاء اللہ جنوبی ہند کا ندوۃ العلماء ہوگا۔ مگر اس قسم کا مدرسہ قائم کرنا کوئی

آسان بات نہیں ہے، اس کے لئے بے انتہا اور انتھک جدوجہد کرنی ہوگی، وسائل کی بہتات اور کارکنوں کی ایک ٹیم درکار ہوگی اور یہ کام اہم بھی ہے اور مشکل بھی۔ مگر ہمیں تو "انَّ مع العُسرِ یُسرا" کا مژدہ جانفزا سنایا گیا ہے۔ لہٰذا ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ بھی نہیں سکتے۔ ہمارا کام تو سعی وجہد ہے، کامیابی عطا کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ اگر اخلاص کے ساتھ کام کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کامیابی ضرور عطا فرمائے گا۔

تدریج کے اصول کے تحت ہمارا منصوبہ یہ ہے کہ ہم اس کام کو دو مرحلوں میں مکمل کریں:۔

پہلے مرحلے میں ایسا تعلیمی ادارہ بنائیں جس میں انگریزی کالجوں کے فارغ شدہ ذہین اور منتخب طلبہ کے لئے وظائف جاری کر کے انہیں عربی زبان اور علوم اسلامیہ کی تعلیم کا انتظام کیا جائے، اسی طرح عربی مدارس کے فارغ شدہ باصلاحیت اور ہونہار افراد کے لئے انگریزی زبان اور علوم جدیدہ کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ اس طرح ہم کم سے کم مدت میں بہتر نتائج پیدا کر سکتے ہیں اور دوسرے مرحلے میں وہ طریقہ اختیار کریں جس میں شروع ہی سے طلبہ کو علوم اسلامیہ اور علوم جدیدہ کی تعلیم مساوی طور پر دی جائے۔

بہرحال ایک تحقیقی ادارے کے لئے جب تک رفقائے کار (فیلوس) کی ایک جماعت فراہم نہ ہو جائے، خاطر خواہ کام ہونا بہت مشکل ہے اور رفقاء کی تیاری کے لئے ایک مدرسے کا وجود نہایت ضروری ہے۔ اس طرح یہ دونوں کام لازم و ملزوم نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے فرقانیہ اکیڈمی کے اغراض و مقاصد میں شروع ہی سے ایک معیاری درس گاہ "جامعہ فرقانیہ" کے نام سے قائم کرنے کا منصوبہ بھی شامل ہے، جس کی تحریک ماہنامہ "فیوچر گرم" کے ذریعہ چلائی گئی۔ اس اقدام سے دوہرے فوائد حاصل ہوسکتے ہیں۔

ضرورت ہے کہ ہمارے ارباب حل و عقد اس مسئلہ پر پوری سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ غور کریں اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی خاطر کسی بھی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کریں ورنہ آنے والا وقت ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ حالات کے رُخ اور زمانے کے تقاضوں سے صرف نظر کرنا ملی حیثیت سے خودکشی کا باعث ہوگا، حالاں کہ زندہ قومیں اپنے آپ کو ہمیشہ نئے ہتھیاروں سے مسلح کرتی رہتی ہیں۔

فرقانیہ عربک ایوننگ کالج

ہمارا نظریہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو اگر اسلام سے کما حقہ روشناس کرانا ہے تو وہ موجودہ دور کے تقاضے کے مطابق زیادہ بہتر طور پر اسلام کی خدمت کر سکتا ہے۔ لہٰذا ہمارے پیش نظر وسیع پیمانے پر عربی زبان کی تعلیم و ترویج کا منصوبہ بھی ہے، یعنی خواہشمند افراد کو جدید عربی زبان میں لکھنے، پڑھنے اور بولنے کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ وہ ایک عربی معاشرہ میں پوری طرح کھپ سکیں۔ آج کل چوں کہ ہمارے تعلقات مختلف عرب ممالک سے بڑی تیزی کے ساتھ بڑھ رہے ہیں اور بہت سے لوگوں کو عربی زبان کی تحصیل کی ضرورت بڑی شدت کے ساتھ محسوس ہو رہی ہے، لہٰذا اس طرف بھی فوری توجہ کی ضرورت ہے۔

مگر چوں کہ آجکل ہندستان کے عربی مدارس میں عربی زبان سکھانے کا جو طریقہ عام طور سے رائج ہے وہ بہت فرسودہ ہے۔ ضرورت ہے کہ جدید طریقے اور نئے اصولوں کے تحت اس زبان کی تعلیم دی جائے۔ اس مقصد کے لئے ہم "جامعہ فرقانیہ" کے تحت ایک ایسا ایوننگ کالج" بھی قائم کرنا چاہتے ہیں، جس میں ہمارے نوجوانوں اور دیگر ضرورت مندوں کو کم سے کم مدت میں اتنی عربی سکھا دی جائے کہ وہ اس زبان میں لکھ پڑھ اور بول بھی سکیں اور قرآن و حدیث کو بھی بخوبی سمجھ سکیں۔ اس مقصد کے لئے مختصر طور پر ایک سالہ اور دو سالہ کورس جاری کرنے کا ارادہ ہے۔

یہ کام فرقانیہ اکیڈمی کچھ عرصے سے وسائل کی کمی کی بنا پر محدود طور پر کر رہی ہے، مگر ضرورت ہے کہ اس کام کو وسیع پیمانے پر کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مختلف مقامات پر کوچنگ کلاس کے طور پر سنٹرس قائم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ زیادہ بہتر نتائج برآمد ہو سکیں۔

جامعہ فرقانیہ کا نظام تعلیم:

جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں ہمارے نونہالوں کو علوم اسلامیہ کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ سے بھی روشناس کرانا ضروری ہے تاکہ پیش پا افتادہ ملی و انسانی مسائل حل ہوں اور عالم انسانی کی صحیح فکری رہنمائی عمل میں آئے۔ اس منصوبے کے تحت مجوزہ جامعہ کی پوری تعلیمی مدت کو حسب ذیل تین مراحل میں تقسیم کر کے بتدریج علوم اسلامیہ اور علوم جدیدہ کی تکمیل کرائی جا سکتی ہے۔

۱۔ ہائی اسکول لیول:۔ ابتدائی پانچ سال کی مدت میں مولوی کورس کی ضروری کتابیں اور حکومت کے نصاب کے مطابق ہائی اسکول کورس مکمل کرا دینا۔ اس مختصر نصاب کی تکمیل کے بعد فارغ ہونے والے کو "مولوی عالم" کی سند دیجائے۔

نوٹ:۔ اتنی تعلیم اگر تمام مسلمان بچوں کے لئے لازمی کر دی جائے (بشرطیکہ اس کا انتظام ہو سکے) تو ہماری ملی زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب آسکتا ہے۔ اس بنیادی تعلیم کے بعد ہمارے نونہالوں کو کسی بھی قسم کی مزید تعلیم دی جا سکتی ہے۔

۲۔ پری یونیورسٹی لیول:۔ عالم کورس مکمل کرنے کے بعد مزید تین سال کی مدت میں مولوی کورس کی اونچی تعلیم اور سرکاری نصاب کے مطابق پری یونیورسٹی کا کورس مکمل کرایا جائے۔ اس کورس کی تکمیل کے بعد فارغ ہونے والے کو "مولوی فاضل" کی سند دی جائے۔

۳۔ بی۔ اے لیول:۔ پھر اس کے بعد مزید دو سالہ مدت میں عربی اور انگریزی کے ساتھ ساتھ علوم اسلامیہ یا علوم جدیدہ[1] میں سے کسی ایک مضمون میں خصوصیت کے ساتھ تکمیل کرائی جائے، جس کے بعد اس کو "مولوی کامل" کی سند دی جائے۔

نوٹ: یہ صرف ایک ذہنی خاکہ ہے۔ ماہرین غور و فکر کر کے ان مراحل کی مدت اور طریقۂ کار میں مناسب تبدیلی اور کمی بیشی کر سکتے ہیں۔

"فرقانیہ ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ" کے قیام کا منصوبہ

ہائی اسکول لیول کے بعد جو طلبہ اپنی معاشی مجبوریوں کی وجہ سے مزید تعلیم حاصل نہ کر سکتے ہوں تو انہیں ہمارے مجوزہ ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ میں داخل کر کے انہیں فنی تعلیم دی جائے تاکہ وہ معاشی میدان میں اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں، مثلاً کتابت، جلد سازی، طباعت، الکٹریکل فٹنگ، نجاری، لیتھ ورک، پلاسٹک انڈسٹری اور کاٹیج انڈسٹری کے مختلف فنون وغیرہ۔

نیز ایسے طلبہ فنی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اگر چاہیں تو ہمارے مجوزہ ایوننگ کالج میں داخلہ لے کر اپنی مزید تعلیم بھی جاری رکھ سکتے ہیں۔

یہ اسکیم اگر صحیح طور پر روبعمل آجائے، تو ہماری ملی زندگی کی کایا پلٹ سکتی ہے اور اتنے کثیر فوائد حاصل ہو سکتے ہیں جو بیان سے باہر ہیں، بشرطیکہ منظم پیمانے پر کام کیا جائے۔

ملت کا درد رکھنے والے چند باہمت اور مہم جو افراد اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہو جائیں تو یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے جو انجام نہ پا سکتا ہو۔

جب تک یہ کام نہیں ہوگا، ہمارے ملی مسائل حل نہیں ہو سکتے اور نہ اقوام عالم کے مقابلے میں ہمارا اخلاقی و تعلیمی معیار اونچا ہو سکتا ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے ــــ اور اس موضوع پر بحث و مباحثے بھی ہو چکے ہیں کہ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ فنی تعلیم کا جوڑ صحیح نہیں ہے، یا دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ فنی تعلیم حاصل کرنا بہت مشکل اور کارے دارد ہے وغیرہ۔ لیکن ہم نے اوپر جو نظام اور خاکہ پیش کیا ہے اس کے تحت یہ دونوں مقاصد (حسب قابلیت) بخوبی حاصل ہو سکتے ہیں۔

اصل بات قابلیت اور صلاحیت کی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام طلبہ کے لئے دونوں قسم کی نصابی اور فنی تعلیم لازمی کر دی جائے۔ بلکہ یہ طریقہ بہت مضر اور نقصان دہ ثابت ہوگا۔ ہاں صلاحیت و قابلیت کے مطابق انہیں مختلف لائنوں میں لگایا اور کھپایا جا سکتا ہے۔

فرقانیہ ہاسٹل کے قیام کا منصوبہ:

شہر کے وسط میں ایک ایسا ہاسٹل (HOSTLE) چلانے کا منصوبہ بھی ہے جس میں شہر کے مختلف سرکاری و غیر سرکاری کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے والے مسلمان طلبہ قیام کر سکیں اور ان کی تربیت اور فکری نشو و نما اسلامی خطوط پر عمل میں آسکے۔ ہماری ملت کے وسیع تر مفاد کے لئے اس طرح کا ایک آئیڈیل دارالاقامہ چلانا بہت ضروری ہے۔

اس اسکیم کے مطابق ایک منصوبہ بند طریقہ پر شام کے خارج اوقات میں چند ہلکے پھلکے دینی و اسلامی پروگرام اور ہفتہ واری اجتماعات رکھے جا سکتے ہیں، جن کے ذریعہ انکی صحیح غذا فراہم ہو اور موجودہ خرابیوں کا سدِّ باب بھی ہو سکے، نیز اس کے علاوہ اس مجوزہ ہاسٹل میں طلبہ کے کوچنگ کلاسز بھی بڑی کامیابی کے ساتھ چلائے جا سکتے ہیں۔ اس میں ایک لکچر ہال اور ایک لائبریری کا ہونا بہت ضروری ہے۔

٭٭

[1] مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ، ادب یا سائنس، فلسفہ، معاشیات، سماجیات وغیرہ۔

خطبۂ صدارت

آل کیرالا اردو کانفرنس منعقدہ ۸ مئی ۷۶ء

پہلا سشن ــــ مندوبین

جناب ڈاکٹر سید انور علی صاحب (ایم۔ ایس سی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ پرنسپل انجمن آرٹس اینڈ سائنس کالج۔ بھٹکل (این۔ کے) کرناٹک اسٹیٹ

۷۸۶

معزز حاضرین اور مندوبین کانفرنس!

میں مجلس منتظمہ اور چیرمین جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب آل کیرالا اردو کنونشن کا سراپا سپاس ہوں کہ انہوں نے مجھے گوشۂ عزلت سے نکال کر رونق بزم بنایا اور اس کنونشن کے جلسۂ اول کی صدارت کے لئے منتخب فرماکر قدردانی کا ثبوت دیا۔ میں ان کی اس عزت افزائی پر دل کی گہرائیوں سے ان کا ممنون و مشکور ہوں۔

محبان اردو!

آج آپ کے سامنے جو لوگ موجود ہیں وہ محض اس وجہ سے یہاں تشریف لائے ہیں کہ انھیں ہندوستان کی ایک ایسی زبان سے پیار و محبت ہے جس کی شیرینی و دلآویزی دوسری زبانوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ اس زبان کو عرف عام میں "اردو" کہتے ہیں۔ کیرالا ہندوستان کی وہ ریاست ہے جو شمالی ہند سے کم از کم ۲ ہزار میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور جس کی ریاستی زبان ملیالم ہے اس کے باوجود یہاں کے باشندوں کا زبانِ اردو سے یہ دلچسپی اور شوق محض ان کی زبان دوستی کی غماز ہے اور کچھ نہیں۔ اس سے زبان اردو کی اپنی خصوصیت کا اعتراف ہوتا ہے اور دوست و دشمن کو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ "اردو" ہندوستان کی وہ واحد زبان ہے جو عوام کے دلوں سے قریب تر ہے اور جو اُن کے احساسات و جذبات کی بہتر ترجمانی کرتی ہے اور آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے یہ بات معجزہ سے کم نہیں کہ جس کیرالہ میں ۴۰۔۵۰ سال قبل اردو کا نام بہت سے لوگوں کو معلوم نہ تھا آج اسی کیرالہ میں اتنی بڑی شاندار کانفرنس ہو رہی ہے اور گہوارۂ اردو شمالی ہند کے ادباء و شعراء کی نگاہیں اس کی کامیابی پر لگی ہوئی ہیں۔ یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اردو صرف شمالی ہند کی زبان نہیں ہے بلکہ جنوبی ہند کی بھی زبان ہے یا اسی کو یوں کہہ لیجئے کہ پورے ملک کی زبان ہے۔

ہم اُن لوگوں میں سے ہوں جو زبان، نسل اور رنگ کی بنیاد پر انسانوں میں تفریق کو جائز نہیں سمجھتے ہیں۔ مگر اس حقیقت سے آپ جیسے اہل علم اور صاحب بصیرت حضرات بخوبی واقف ہیں کہ اگر کسی قوم کو ختم کرنا ہو تو اس کا رشتہ اس کے ماضی سے کاٹ دینا چاہئے اور ماضی سے کاٹ دینے کا سب سے آسان نسخہ یہ ہے کہ اس کی مادری زبان ختم کر دی جائے۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ہندوستان ایک ہزار سال تک مسلمانوں کے زیر انتظام رہا۔ مختلف وجوہ کی بنا پر اس زمانہ میں سرکاری زبان عربی کے بجائے فارسی رہی۔ اس کے بعد مختلف زبانوں کے اتصال اور میل جول سے زبان "اردو" بنی جس کی پوری تاریخ بیان کرنا آپ جیسے ذی علم حضرات کے سامنے ضروری نہیں۔ البتہ یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ مسلمانوں نے اس زبان کو فارسی کے مقابل میں اپنایا اور چونکہ حکومت اور ریاست باقی تھی اس لئے آسانی سے اپنی تمام مذہبی تعلیم اور ثقافتی معلومات اس زبان میں منتقل کر دیا اس طرح فارسی کا چلن اٹھ جانے کے باوجود اُن کا رشتہ ان کے ماضی سے قائم رہا اور برطانوی حکومت کی پیدا کردہ ہزار پریشانیوں اور مزاحمتوں کے باوجود اپنے کلچر اور اپنی ثقافت سے ناآشنا نہ ہو سکے حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان نے مذہبی اور تہذیبی ورثہ کو منتقل کر کے ہمارے اسلاف نے ہم پر وہ احسان کیا ہے جس سے ہم کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ آج اردو صرف مسلمانوں کی مادری زبان ہی نہیں ہے بلکہ اُسے اُن کی تہذیب، اُن کی ثقافت اور اُن کے مذہب کے امین ہونے کا بھی شرف حاصل ہے۔ اس لئے فطری طور پر وہ دوسروں کے مقابلہ میں اس زبان سے زیادہ تعلق رکھنے پر مجبور ہیں۔

اس وطن عزیز میں مسلمانوں کی دو ذمہ داریاں ہیں۔ ایک بحیثیت امت مسلمہ کے اسلام سے وابستگی اور ربط باہمی اور دوسرے بحیثیت شہری برادران وطن کے دکھ درد میں شریک ہونا اور ملک کی تعمیر و ترقی میں حصہ لینا۔ یہ دونوں حیثیتیں کسی طرح ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ معاون و مددگار ہیں بشرطیکہ انہیں صاف دل اور وسعت نظر سے دیکھا اور سمجھا جائے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا سب سے پیچیدہ مسئلہ یہ ہے کہ وہ خود ایک نظریۂ حیات کے حامل ہیں، ایک عالمگیر تہذیب و تمدن کے وارث ہیں اور انسانیت کی بہتر صورت گری کے لئے اُن کے پاس خود اپنے اصول و ضوابط ہیں جن سے دست بردار ہونے کے لئے وہ کبھی تیار نہیں۔ بعض کوتاہ نظر جو ان اصولوں سے ناواقف ہیں، سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کا اصول تہذیب و تمدن اور نظام معاشرت وغیرہ اس دور میں قابل قبول نہیں ہو سکتے اس لئے انھیں ترک کر دینا چاہئے۔ مگر چونکہ مسلمان مجموعی طور پر اس کے لئے راضی نہیں ہیں اس لئے کچھ خوبیاں اکثر چلتی رہتی ہے۔ علامہ اقبالؔ نے اسی بات کو ایک جگہ اس طرح پیش کیا ہے ؎

"خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی"

اپنی اسی مخصوص تہذیب و تمدن کی بقاء و حفاظت کے لئے مسلمانوں کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ ملک میں پھیلے ہوئے تمام ہم عقیدہ لوگوں سے ربط رکھیں اور اتحادِ اُمت کے لئے اسی ہم کے جائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے یہ بات بھی ناگزیر ہے کہ کوئی زبان ایسی ہو جو ملک کے طول و عرض میں آسانی سے سمجھی جا سکتی ہو اور جس کے ذریعہ ان کے اسلاف سے اُن کا رشتہ باقی رہے اور جس میں ان کے اکابر کے علمی اور تہذیبی کارنامے ہوں۔

ظاہر ہے ان خصوصیات کی حامل ہندوستان کی تمام زبانوں میں سے صرف اردو ہی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اتحادِ امت کے لئے اردو ہی کو رابطہ کی زبان قرار دیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ریاست کے مسلمانوں نے اپنی اپنی جگہ پر اردو کی تعلیم کا انتظام کیا تاکہ مسلمانوں کا ربط باہمی اور اسلامی رشتہ ٹوٹنے نہ پائے اور "فاصلہ" کی بنا پر آپس میں بیگانگی اور اجنبیت کا احساس پیدا نہ ہو اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی وہ بنیادی احساس ہے جس نے کیرالہ کے اُن مسلمانوں کو آل کیرالہ اردو کنونشن پر مجبور کیا جن کی ریاستی اور مادری زبان ملیالم ہے۔

دوسرا محرک جو اس کنونشن کے انعقاد کا باعث بنا وہ خود اردو زبان کی اپنی خصوصیت ہے۔ اس کی لطافت و شیرینی ہے۔ احساسات و جذبات کی بہتر ترجمانی ہے اور ایک بہتر تہذیب کی نمائندگی ہے اس حیثیت میں وہ مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لئے یکساں عزیز اور دلآویز ہے۔ ہر وہ شخص جسے اس زبان کی لطافت، اسلوب اور رعنائی پسند ہے۔ وہ اردو کا ہمنوا ہے اور اس کنونشن کا داعی ہے۔ مگر یہ بات محبان اردو کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونی چاہیے کہ انسان، اپنے خیالات اور تہذیبی ورثہ کو ادب ہی کے ذریعہ سماج میں پھیلاتا ہے اس طرح ہر زبان کے ادب میں کچھ نہ کچھ ایسی باتیں ضرور ہوتی ہیں جن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ آپ کو غیر کسی عصبیت میں مبتلا ہوئے ملکی اور غیر ملکی ادب سے استفادہ کرنا چاہیے اور اردو ادب کو مختلف الفاظ، خیالات اور اقدار سے مالا مال کرنا چاہئے۔ زبان کی بنیاد پر دیواریں کھینچ کر بیٹھ رہنا صحیح نہیں ہے۔ ہمیں چونکہ انسان کو سمجھنا ہے، اسکے خیالات و تجربات سے فائدہ اٹھانا ہے اس لئے ہر انسانی زبان سے ربط و محبت رکھنا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر تمام

انسانی ورثہ سے فائدہ اٹھانا ممکن نہیں ہے۔

عزیزان گرامی!

آپ نے شہر کے باغوں میں صبح سویرے چہل قدمی کی ہوگی اور اپنے پائیں باغ میں بھی محو خرام رہے ہوں گے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اُسی باغ میں جہاں صبح کو ایسے جانور آتے ہیں جو فرش زمین پر پڑی ہوئی گندی چیزوں سے اپنی تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں، وہیں بلبل بھی آتی ہے اور گل و لالہ اور سرو سمن سے اپنا ذوق جمال پورا کرتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ محض اس وجہ سے کہ دونوں کا مذاق مختلف ہے۔ اسی طرح جس سماج میں ہم اور آپ رہتے ہیں اس میں جہاں باغ کی کثافتوں کی طرح بُرائیاں ہیں وہیں حسین و دلکش پھولوں کی طرح اچھائیاں بھی ہیں۔ اب یہ ادیب و شاعر کے ذوق اور فطرت سلیم پر منحصر ہے کہ ان میں سے کس کو اپنے موضوع کے لئے انتخاب کرتا ہے۔ ظاہر ہے جیسا جس کا ذوق اور معیار ذوق ہوگا ویسی ہی اس کی پسند ہوگی۔ اگر کسی ادیب و شاعر کا ذہن اعلیٰ اقدار اور شرف انسانی کے احساس سے خالی ہے تو ظاہر ہے کہ اسکے جذبات و احساسات جانوروں کے جذبات و احساسات سے زیادہ بلند نہیں ہو سکتے۔ نتیجۃً اس کی شاعری یا اس کا ادب شکم و جنس ہی کے گرد گھومے گا۔ اس کے برعکس اگر کسی ادیب و شاعر کا دماغ و دل اعلیٰ اقدار اور شرف انسانی کے احساس سے بھرپور ہے تو پھر اس کے ادب میں شکم و جنس کا موضوع بھی بلند اخلاقی اقدار کے پرتو میں اس طرح بیان ہوگا کہ انسانی جذبات میں حیوانیت کا احساس نہ جاگے بلکہ قاری کے ذہن کا رُخ شرف انسانی کی اس منزل کی طرف مڑتا چلا جائے جسے ایک اچھے انسانی سماج کے لئے ناگزیر تصور کیا جاتا ہے۔ جس طرح مقصد سے بیگانہ ادب سماج کے لئے ایٹم بم سے زیادہ خطرناک ہیں اُسی طرح سماج کے لئے وہی شاعر و ادیب مفید رہے ہیں جنھیں کسی نہ کسی نظریۂ حیات اور نظام فکر کا شعور رہا ہے۔ رہا ان کے نظریہ سے اختلاف تو اس کی گنجائش ہمیشہ رہی ہے اور رہے گی اس لئے کہ اگر آپ ایک نظریۂ حیات کو صحیح سمجھتے ہیں تو دوسرا کسی اور نظریۂ زندگی کو پسند کرے گا اسی طرح اختلاف کا ہونا لازمی و فطری امر ہے، اور ان اختلافات کو علمی بنیاد پر زیر بحث و زیر تنقید لانا بھی ناگزیر ہے جسے گوارہ کرنا چاہئے کیونکہ اسی بحث و تمحیص سے زندگی کے نئے نئے رُخ اور حل سامنے آتے ہیں اور ذہن کو سوچنے، سمجھنے، پرکھنے اور کسی نتیجہ پر پہونچنے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔ آپ کو چاہئے کہ اپنا دامن کسی نہ کسی نظریہ فکر اور فلسفۂ حیات سے ضرور وابستہ رکھیں اس نظریۂ حیات کو سرسری طور پر نہیں بلکہ سمجھ بوجھ کر اور خوب پرکھ کر انتخاب کیجئے تاکہ وہ آپ کے دل کی دھڑکن بن جائے اور آپ کی صلاحیتوں کو سماج کے بہتر بنانے پر اُکسائے تاکہ آپ گل و بلبل، لب و رخسار، زلف شبگیں اور ہجر و وصال کے گرفتار محض بن کر نہ رہ جائیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ باتیں زندگی کے حقائق میں سے نہیں ہیں مگر یہ ساری زندگی نہیں ہے اس لئے کہ ؎

اور بھی کام ہیں دنیا میں محبت کے سوا

موجودہ زمانے میں بعض لوگ چاہے انسان کو انسان کہنے میں تکلف کرتے ہوں مگر انسان کا "سماجی جانور" (سوشل اینیمل) ہونا انھیں بھی تسلیم ہے لفظ "سماجی" کا یہ اضافہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان اپنی فطرت و جبلت میں دوسرے انسانوں سے ربط و تعلق رکھنے کا داعیہ رکھتا ہے اور جہاں اُسے اپنی ذات سے دلچسپی ہوتی ہے وہاں وہ سماج سے بھی بیگانہ نہیں رہتا اور نہیں رہ سکتا ہے۔ انسانی سماج سے اس ربط و تعلق کی بنا پر چاہے کوئی گروہ کسی مذہبی عقیدہ کو مانے یا نہ مانے مگر وہ انسانی سماج کے لئے چند صفات کو ہمیشہ سے پسند کرتا آرہا ہے اور بعض اوصاف کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا رہا ہے۔ سچائی، انصاف، پاس عہد، ہمدردی، ضبط نفس، اولوالعزمی، فرض شناسی، احسان، ذمہ داری اور امانت داری ہمیشہ سے انسانی سماج کے پسندیدہ اوصاف رہے ہیں۔ اسکے برعکس جھوٹ، ظلم، بدعہدی، خودغرضی، بندگیٔ نفس، بزدلی، نافرض شناسی، کام چوری اور غیر ذمہ داری جیسی صفات کبھی بھی قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھی گئیں۔ اسی طرح چوری، زنا، قتل، ڈاکہ، جعل سازی، رشوت خوری اور ضمیر فروشی کبھی بھی اچھے افعال نہیں سمجھے گئے۔ انسانیت اپنا اچھا عنصر اُنھیں لوگوں کو سمجھتی رہی ہے جو پاک دامن، راست باز، باضمیر اور خیر اندیش ہوں۔ جن کا ظاہر و باطن یکساں اور قول و فعل مطابق ہو۔ جو امن سے رہیں اور دوسروں کو امن سے رہنے دیں۔ جن کی ذات سے ہر ایک کو خیر کی امید ہو اور کسی کو بُرائی کا اندیشہ نہ ہو۔ آپ لوگ جو اردو زبان کی محبت میں یہاں دور دراز سے کھنچ کر آئے ہیں اور خصوصیت سے وہ حضرات جو اہل قلم ہیں، صاحب طرز ادیب و شاعر ہیں، افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں۔ میں اُن سے نہایت ادب سے عرض کروں گا

کہ وہ اپنا احتساب کریں کہ کیا واقعی آپ کا قلم اُن انسانی اعلیٰ صفات کو پروان چڑھانے کے کام آتا ہے جو انسانیت کا مشترکہ ورثہ، اور "اصل جوہر" ہیں۔ اگر ایسا ہے تو سماج کو آپ پر فخر ہے اور آپ کا سماج پر احسان ہے لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو میں آپ کے منصب و مقام کو یاد دلاتے ہوئے یہ عرض کروں گا کہ آپ سماج کی تعمیر میں اپنی صلاحیتوں کو وقف کر دیں اور اُن انسانی صفات کو اپنے قلم کی صلاحیتوں سے آب و تاب بخشیں جن کے اپنانے سے ایک اچھا اور صالح معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔ آج مختلف زبانوں میں جو ادب بازار میں آرہا ہے اس کا بیشتر حصہ "لذت کام و دہن" کے گرد گھومتا ہے، سنسنی خیز واقعات، جرائم کی نقالی اور گندی رومانی کہانیوں سے بھرپور ہے۔ ظاہر ہے ایسا ادب سماج کے ذہن کو کسی پاکیزہ معاشرہ کے لئے نہیں اُبھار سکتا ہے جہاں محنت، ایثار، وفاشناسی، پاکدامنی، خیرخواہی اور اعلیٰ کردار کی ضرورت ہے۔ اردو ادب کو انسانی ہمدردی کی عکاسی میں اتنا آگے بڑھ جانا چاہئے کہ یہاں کے ہر بسنے والے کو اُردو ادب میں اپنے دل کی آواز سُنائی دے اور اُسے سماج کی بھلائی کی امیدیں اسی اردو ادب سے ہوں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے ادیب، شاعر اور افسانہ نویسوں نے عوام کا مزاج کافی حد تک بگاڑ دیا ہے اور انھیں ایسی لذتیت کا شکار بنا دیا ہے کہ سنجیدہ ادب انھیں بالکل نہیں بھاتا۔ اس صورت حال کے پیدا کرنے میں فلمی ادب و اداکاری کا بڑا ہاتھ ہے جس کا معیار روز بروز پست سے پست تر ہوتا جارہا ہے مگر ان سب کے باوجود ہمارے ادیب اور اہل قلم ہی اس تباہی کو روک سکتے ہیں اور عوام کا مزاج بدل سکتے ہیں بشرطیکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو صحیح طور پر استعمال کریں۔ اب انھیں اس عزم راسخ کے ساتھ ادب کے میدان میں قلم اُٹھانا ہے کہ انسانی فطرت کے مخفی تاروں کو چھیڑنا ہے تاکہ "خیر" اُبھرے اور انسانیت کو اپنی متاع گمشدہ کا پتہ مل جائے۔ یہ کام ہے مشکل لیکن "انسان اور انسانیت" سے پیار ہے تو اس کو اپنائے بغیر کوئی چارہ نہیں اور اس لئے بھی ضروری ہے کہ ؎

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

(اقبالؒ)

اُردو والوں کو چاہئے کہ وہ اس طرف اپنی اولین فرصت میں توجہ دیں کیونکہ یہ پورے ملک کو سنوارنے اور بنانے کا مسئلہ ہے۔ اگر اُردو والوں نے اپنے نگارشاتِ قلم سے ہندوستانی سماج کا رُخ ان انسانی صفات کی طرف موڑ دیا تو یہ پورے ملک پر ایک عظیم احسان ہوگا اور خود اہل ملک اُردو کو ایک ناگزیر زبان اور متاع بے بہا سمجھ کر اس سے قریب سے قریب تر ہوتے چلے جائیں گے اور ان کی بے سوچی سمجھی نفرت پیار میں بدل جائے گی اس لئے کہ زمانہ کا یہ عام دستور ہے کہ لوگ دوڑ کر وہاں ہی جاتے ہیں جہاں سے انہیں کچھ ملنے کی امید ہوتی ہے اور اُسی سے پیار کرتے ہیں جو ان کے لئے نفع بخش ہو۔

یہ غلط فہمی عام طور پر پھیلانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ "اُردو مسلمانوں کی زبان ہے۔" یہ انتہائی شرانگیز بات ہے جسے تنگ نظر اور فرقہ پرست لوگوں نے اپنی گندہ ذہنیت کی تکمیل کے لئے عوام میں پھیلایا ہے تاکہ اُردو جیسی حسین و دلکش اور شیریں زبان کے مٹانے میں آسانی سے تعاون حاصل ہو سکے کیونکہ انھیں معلوم ہے کہ جب جذبات کی رو میں کسی مسئلہ کو دیکھا جاتا ہے تو پھر معقولیت اور نامعقولیت کا سوال درمیان سے اُٹھ جاتا ہے اور انسان اپنی قیمتی سے قیمتی چیز ضائع کرنے کے لئے آسانی سے تیار ہو جاتا ہے یہی کچھ معاملہ اُردو کے ساتھ ہے ورنہ کون نہیں جانتا کہ اردو ہندو مسلم اتحاد کی نشانی ہے۔ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی نمائندہ ہے جس کی آبیاری میں ہندو مسلم دونوں نے حصہ لیا ہے۔ اس کی تخلیق و نشو و نما میں اگر ایک طرف میر، غالب، حالی، اقبال، جگر اور سردار جعفری ہیں تو دوسری طرف دیا شنکر نسیم، رتن ناتھ سرشار، تلوک چند محروم، فراق گورکھپوری، جگن ناتھ آزاد، آنند نرائن مُلا، کرشن چندر اور گوپال متل جیسے جانے کتنے نامور غیر مسلم ادیب و شاعر ہیں جنھوں نے اُردو کو اپنے خون جگر سے سنوارا ہے اور گیسوئے اُردو کی اپنے ہاتھوں سے شانہ کشی کی ہے۔

ان حقیقتوں کے باوجود اگر کوئی اُردو کو ہندوستان سے اس لئے مٹانا چاہتا ہے کہ وہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے تو وہ تاریخ سے ناواقف ہے، انصاف پسند نہیں، ظالم ہے، انسان دوست نہیں انسان دشمن ہے، اس ملک کا اور ہندو مسلمان دونوں کا دشمن ہے، اس گنگا جمنی تہذیب کا دشمن ہے جو ملک کا مشترکہ تہذیبی ورثہ ہے میں ایسے تمام لوگوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ جس طرح اُن کے آنکھیں بند کر لینے سے مہر درخشاں کے وجود کی نفی نہیں ہوتی اسی طرح ان کے

اُردو کی اہمیت تسلیم نہ کرنے سے اُردو کا کچھ نہیں بگڑتا بلکہ اہل ہوش و خرد کے سامنے خود اُن کے اندرون کی عکاسی ہوتی ہے۔ اب اُردو اپنی لسانی خصوصیات کی بنا پر صرف ایک قومی زبان ہی نہیں رہ گئی ہے بلکہ وہ ایک بین الاقوامی (انٹرنیشنل) زبان بنتی جارہی ہے مثلاً سوویت روس میں اردو کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ تاشقند، سمرقند، بخارا، ماسکو اور لینن گراڈ کے بہت سے سکنڈری اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ اسی طرح حکومت امریکہ نے شکاگو اور کیلیفورنیا کے کچھ کالجوں میں اُردو کو لازمی مضمون قرار دیا ہے۔ نیویارک کے فورڈن یونیورسٹی کے ایک الحاقی کالج میں داخلہ حاصل کرنے والے طلبہ اردو کو بحیثیت ایک مضمون اختیار کرنے کے پابند ہیں۔ شکاگو یونیورسٹی میں اُردو کا ایک علیحدہ مستقل شعبہ ہے جہاں سے "نئی صدی" کے نام سے ایک رسالہ بھی نکلتا ہے۔ ماریشس کے ۶۵٪ عوام کی مادری زبان اُردو ہے۔ گیانا (جنوبی امریکہ) کے ۴۵٪ باشندوں کے اظہار خیال کے ذریعہ اُردو ہے۔ جرمنی کی ۷ یونیورسٹیوں میں اُردو پڑھائی جاتی ہے۔ نیپال کے سکنڈری ایجوکیشن بورڈ نے اُردو کو اپنے نصاب میں شامل کر لیا ہے۔ اسی طرح دوسرے ممالک مثلاً برما، سنگاپور، لنکا، ملیشیا، افغانستان اور سعودی عرب میں اُردو سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ بات بالکل عیاں ہے کہ اگر ہندوستان کو اپنی تہذیب و ثقافت سے بین الاقوامی طور پر لوگوں کو روشناس کرانا ہے تو اس کے لئے اُردو سے بہتر کوئی دوسری ملکی زبان نہیں ہے اس لئے حقیقت پسندی کا ثبوت دینا چاہئے اور اس زبان سے نفرت کرنے کے بجائے اسے سیکھنے اور فروغ دینے کی کوشش کرنی چاہئے۔

ماہنامہ "تحریک" دہلی کے ایڈیٹر جناب گوپال متل صاحب جو اُردو کے صاحب طرز مضمون نگار اور مخلص دوست ہیں، انہوں نے اُردو کے تعلق سے ایک مضمون میں بہت ہی حقیقت پسندانہ جائزہ لیا ہے۔ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ان کے تجزیہ کو اُنھیں کی زبان میں آپ کے سامنے پیش کر دوں تاکہ اس کنونشن کو بھی حقیقت پسندانہ طریقہ سے سوچنے سمجھنے کا موقع مل جائے۔ ضروری نہیں کہ آپ اُن کی تمام باتوں سے متفق ہوں مگر اُن کے خیالات سے آپ کے سوچ فکر کو مہمیز ضرور لگے گی۔ تحریر فرماتے ہیں:-

"اگر اردو والے واقعی اپنی زبان کا تحفظ چاہتے ہیں تو انھیں حقائق کا پاس کرنا چاہئے۔ کوئی تحریک واہموں کے زور پر کامیاب نہیں ہو سکتی ......

یہ بھی ایک واہمہ ہے کہ معدودے چند بدطینت فرقہ پرستوں کو چھوڑ کر اکثریتی طبقہ مجموعی طور پر اردو کو اپنی زبان ماننے کے لئے تیار ہے۔ یہ کہنا غالباً صحیح نہیں ہوگا کہ ہندوؤں کی اکثریت اردو زبان سے عناد رکھتی ہے لیکن یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اُنھیں اُردو کے تحفظ سے کوئی خصوصی دلچسپی نہیں ہے۔ کوئی تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتی جب تک اسے پُرخلوص اور سرگرم لوگوں کی تائید حاصل نہ ہو۔ یہ خلوص اور ولولہ اردو تحریک کو مسلمان ہی مہیا کر سکتے ہیں کیونکہ اردو ایک ایسی زبان ہے جو اُن کے ذہن و دل کی ترجمانی دوسری زبانوں کے مقابلہ میں زیادہ بہتر طور پر کر سکتی ہے اور یہ ان کی ثقافت کی علامت بھی ہے۔ میں یہ مشورہ نہیں دے رہا ہوں کہ مسلمان اردو کے بلاشرکت غیرے مالک بن بیٹھیں، روشن خیال غیر مسلم افراد کی تائید حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہئے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اُردو تحریک کے بنیادی اور سرگرم معاون مسلمان ہی ہوں گے"۔

"یہ دلیل کچھ زیادہ وزنی نہیں کہ اگر مسلمانوں نے اردو کو اپنی زبان مان لیا تو غیر مسلم اردو کے اور بھی مخالف ہو جائیں گے۔ یہ تو ممکن ہے کہ غیر مسلم اپنی زبان کی حیثیت سے اردو کی حمایت نہ کریں لیکن مسلمان اس کا تحفظ اپنی زبان کی حیثیت سے کرنا چاہیں تو انصاف پسند غیر مسلموں کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے"۔

"مسلمانوں کا یہ جائز حق ہے کہ وہ حکومت سے اردو کے تحفظ کا مطالبہ کریں یہ مطالبہ بنیادی حقوق کی بنیاد پر کیا جانا چاہئے نہ کہ سیکولرزم اور مشترکہ تہذیب کے نام پر۔ اس بات کا امکان ہے کہ حکومت اردو والوں کے جائز حقوق کو مان لے، لیکن اگر ایسا نہ ہو تب بھی مسلمان اپنی کوششوں سے اُردو کو بچا سکتے ہیں۔ میں باور کرنے سے انکار کرتا ہوں کہ ۶ کروڑ افراد کا ایک فرقہ اپنی زبان کا تحفظ نہیں کر سکتا بشرطیکہ وہ اس کا مصمم عزم کر لے"۔

اس مضمون میں انہوں نے ایک جگہ بڑی ہی تلخ حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے اور بڑی جرأت و بیباکی سے وہ بات کہی ہے جسے بڑے سے بڑا آدمی آسانی سے کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس میں اُردو کے حامیوں اور خصوصاً ان حضرات کے کردار کی بہت اچھی نقاب کشائی کی ہے جو اُردو کے بہت بڑے اور پُرجوش حامی سمجھے جاتے ہیں۔ اُن کے خیال میں ایسے ہی حضرات کی وجہ سے اردو کے کاز کو نقصان پہونچ رہا ہے اور منزل مقصود ہاتھ میں نہیں آتی۔ خدا سے دُعا کرتا ہوں کہ اس کانفرنس کے مندوبین اور حامیان اردو کو جناب گوپال متل صاحب کے احساسات و تاثرات کے بالکل برعکس بنائے تاکہ یہ کنونشن اردو کے سلسلہ میں کچھ تعمیری اور مثبت رول ادا کر سکے۔ لکھتے ہیں:-

"ریاکاری ہمارا شیوہ ہے لیکن جو لوگ ان دنوں اردو کے مجاہد بنے ہوئے ہیں وہ کچھ زیادہ ہی ریاکار ہیں، وہ اردو کی حمایت میں پُرجوش تقریریں کرتے ہیں اور مضامین لکھتے ہیں لیکن ان تقریروں اور مضامین کے آخر میں چپکے سے ایک ایسی بات کہہ جاتے ہیں جو اُن کی تمام ابتدائی باتوں کی نفی کرتی ہے"۔

برادران عزیز!

زندگی تار حریر دو رنگ سے عبارت ہے۔ تیرگی و نور، ظلمت اور کشمکش خیر و شر ہی میں زندگی کا اصل لطف پوشیدہ ہے۔ عشق و خلوص کے جوہر انھیں اجتماعِ ضدین کی موجودگی سے کھلتے ہیں۔ جہاں مصائب و تکالیف ہوتی ہیں وہیں جذبۂ اندروں میں گرمی اور تڑپ پیدا ہوتی ہے اس لئے آج چاہے حالات کتنے ہی ناسازگار معلوم ہوتے ہوں اگر ہمارے اندروں میں اُردو کے لئے سچی لگن ہے اور ہم انصاف اور معقول طریقہ سے اپنی بات پیش کرتے ہیں تو حالات خود بخود بدلیں گے اس لئے کہ انسانی فطرت کو اس کے اصل مزاج سے زیادہ دنوں تک دور نہیں رکھا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کے باشندے عام طور پر اپنی فطرت کے لحاظ سے دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ نرم دل اور کومل ہردے رکھتے ہیں اس لئے ہمیں اُردو کے سلسلہ میں ان کے تعاون سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں البتہ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہم اُن سے قریب تر ہوں اور اپنے مطالبہ کے معقول اور مبنی بر انصاف ہونے پر انھیں مطمئن کریں۔ اُن سے دور رہ کر ان کے تعاون کی امید رکھنا عبث انتقام میں جینے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اسی کنونشن میں آپ کو مختلف نقطۂ نظر پر اظہار خیال کرنا ہے۔ بحث و مباحثہ کے ذریعہ کسی قدر مشترک کو تلاش کرنا ہے تاکہ تجاویز کی شکل دی جاسکے۔ ہوسکتا ہے کوئی فرد آپ کے خیالات سے متفق نہ ہو اور وہ بعض دلائل کی بنا پر آپ سے اختلاف کرے۔ ہمیں دوسروں کی باتوں کو خوش دلی سے برداشت بھی ہونا چاہئے اور نہ ہی کسی جذباتیت کا شکار ہونا چاہئے کیونکہ بہت سے اچھے اور مفید کام بعض وقت جذباتیت کی وجہ سے خراب ہو جاتے ہیں ہمیں کون سے دوسروں کا نقطۂ نظر سننا ہے ان کی اچھی باتوں کو قبول کرنا ہے اور جو ناپسندیدہ ہوں انھیں احسن طریقہ سے رد کر دینا ہے۔ جمہوریت اور جمہوری طریقوں کی یہی اصل روح ہے جسے پوری طرح تمام کارروائی میں ملحوظ رکھنا چاہئے تاکہ تعاون کی راہیں کھلی رہیں اور مسائل کے سمجھنے اور ان کے حل کے ڈھونڈھنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ میں امید کرتا ہوں کہ تمام مندوبین کنونشن اسی متوقع روش کا ثبوت دیں گے۔

آخر میں ایک بار پھر حکومت کیرالا اور اہل ریاست دونوں کو اُن کی وسعت نظری اور انصاف پسندی پر مبارکباد دیتا ہوں جس کی وجہ سے اس کنونشن کا انعقاد ہوسکا۔ میں داعیان کانفرنس اور مندوبین و حاضرین کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے قدر و منزلت بخشی اور سکون کے ساتھ میری معروضات سنیں۔ ہوسکتا ہے میری غیر سیاسی اور حقیقت پسندانہ باتیں آپ کو تلخ لگی ہوں مگر میں آپ سے یہ عرض کرکے رخصت ہونا چاہوں گا کہ ؎

جن میں تلخ نوائی مری گوارہ کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کار تریاقی

(اقبالؒ)

خدا حافظ!

تعمیر حیات کے قارئین سے: (۱) دفتر تعمیر حیات سے پرچہ پابندی سے روانہ کیا جاتا ہے لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ڈاک کی بدانتظامی اور نامکمل پتہ کی وجہ سے بعض حضرات کو پرچہ نہ پہونچنے کی شکایات ہو جاتی ہے۔ ایسے حضرات سے ہماری گذارش ہے کہ وہ ہمیں تحریری اطلاع کے ساتھ اپنا مکمل اور واضح پتہ بھی بھیجا کریں۔ پتہ اردو کے ساتھ انگریزی میں بھی لکھا جائے۔ نمبر خریداری کا حوالہ بھی ممکن ہو تو دیدیں۔

(۲) جواب طلب امور کے لئے جوابی خط ارسال کریں۔

(منیجر تعمیر حیات)